ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابویحییٰ

فروری ۲۰۲۱

www.inzaar.pk

February 2021
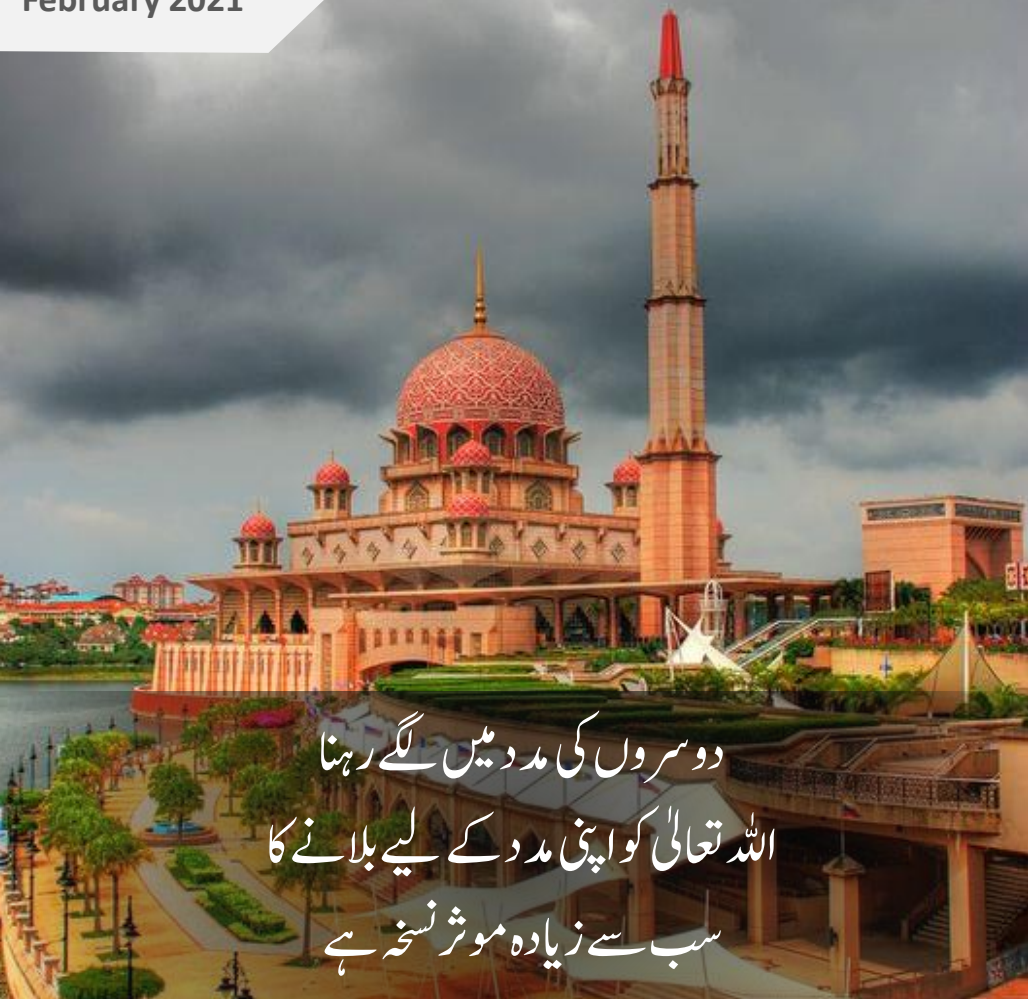
Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

فروری 2021ء   جمادی الثانی/رجب 1442ھ

جلد 9 شمارہ 2

ابویحییٰ کے قلم سے

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

مدیر انتظامی:
غازی عالمگیر

سرکولیشن مینیجر:
وارث رضا

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ، سحر شاہ، عظمیٰ عنبرین

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ ــــ 40 روپے

سالانہ (بذریعہ رجسٹری) صرف 900 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر (VP) یا اکاؤنٹ)

P.O Box-7285, Karachi.

فون: 0332-3051201 , 0312-2099389

ای میل: globalinzaar@gmail.com

web: www.inzaar.pk

آسمان پر تیرے سوا میرا کون ہے؟

قرآن میں بیان ہوا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پرندے اور پہاڑ بھی خدا کی حمد و تسبیح میں ان کے ہم نوا ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت داؤد کی صدا ہی کائنات کا اصل وظیفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہستی، ان کی زندگی اور ان کے وجود کا مرکزی خیال ہیں۔

انبیاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء صفحۂ ہستی کے اس رنگ میں آخری درجہ میں خود کو رنگ دیتے ہیں۔ زبور کی ایک آیت میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے۔

آسمان پر تیرے سوا میرا کون ہے،

اور زمین پر تیرے سوا میں کسی کا مشتاق نہیں (25:73)۔

ان دو جملوں میں مومن کے دل و دماغ کی دنیا کو آخری درجے میں واضح کر دیا گیا ہے۔ نہ وہ خدا کے سوا کسی کو معبود سمجھ کر اس کی عبادت کرتا ہے اور نہ اسے ماورائی طاقتوں کا حامل، مشکل کشا، اور دست گیر ہی سمجھتا ہے۔ اس کا دل انسانوں اور مخلوق کی محبت میں اٹکا ہوا نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کی محبت اس کے خانۂ دل کی واحد روشنی ہوتی ہے۔ یہی اسلام کی دعوت کا خلاصہ ہے۔

مسیحی حضرات نے یہ ستم ڈھایا کہ اپنی محبت و عقیدت کا رخ انسانوں جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کر دیا۔ جبکہ یہود نے دنیا میں غلبہ و اقتدار اور ظواہر دین کی پابندی کو اپنے دین کا اصل ہدف بنا ڈالا۔ قرآن مجید نے انھی غلطیوں کی تصحیح کی اور ان دونوں گروہوں اور ان کی وساطت سے مسلمانوں کو اللہ کے رنگ کو اختیار کرنے کا حکم دیا اور واضح کیا کہ یہ رنگ اسلام یعنی اللہ کے سامنے غیر مشروط طور پر جھک کر اسی کا ہو جانا ہے۔

یہی رنگ انبیاء علیہم السلام کا رنگ تھا۔ مگر آج کے مسلمانوں میں سفید، سیاہ، ہرے، پیلے، کتھئی؛ سارے رنگ ملتے ہیں، خدا کا رنگ نہیں ملتا۔

سیل اور ڈسکاؤنٹ

آج کل مہنگائی کے ہاتھوں ہر شخص پریشان ہے۔ آمدنی کے ذرائع محدود اور ضروریات زندگی بہت زیادہ ہیں۔ ایسے میں لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی جگہ سیل یا ڈسکاؤنٹ پر اشیائے ضرورت مل رہی ہوں تو انھیں نسبتاً کم قیمت پر خرید لیا جائے۔ انسان چونکہ فائدہ پسند مخلوق ہے، اس لیے کھاتے پیتے لوگ بھی ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں کم پیسوں میں زیادہ چیزیں خریدنے کے لیے سیل اور ڈسکاؤنٹ کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جنت بھی ایک سودا ہے۔ اس کی بھی ایک قیمت ہے جو ہر اس شخص کو دینا لازمی ہے جو اس کا طلبگار رہے۔ مگر یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جنت کے اس سودے میں بھی کئی طرح کے ڈسکاؤنٹ دیے گئے ہیں۔ یعنی کم عمل کر کے زیادہ بدلہ حاصل کر لیا جائے۔ اس کے لیے بس شرط یہ ہے کہ دین کی ترجیحات کا علم ہو اور انسان اپنی نفسیات کو اس کے مطابق ڈھال دے۔

مثلاً حسن خلق ایک بہت آسان عمل ہے، مگر جنت کا سودا اس معمولی قیمت کے عوض بھی دستیاب ہے۔ لوگ شب بیداری اور روزوں کی کثرت میں جنت کی قیمت دیتے ہیں اور ایک عقلمند انسان صرف فرائض ادا کر کے حسن خلق کے ذریعے سے جنت کے اعلیٰ مقامات کا سودا خرید سکتا ہے۔

اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کرنا گرچہ خود بہت زیادہ پیسوں کا مالک نہ ہو، لوگوں کی برائی کے باوجود ان کے ساتھ بھلائی کرنا، مشکل حالات میں دین کے تقاضوں کو نبھانا اور سب سے بڑھ کر اپنے فرقہ وارانہ تعصّبات سے اوپر اٹھ کر حق کو قبول کرنا وہ چیزیں ہیں جو کرنے میں بہت معمولی ہیں لیکن ان سب کا بدلہ جنت کے بلند درجات ہیں۔

جنت کی یہ ڈسکاؤنٹ اسکیم ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ بس اپنی نفسیات کو تھوڑا سا کنٹرول کر کے اپنے رویوں کو بدلنا اس کام کی شرط ہے۔

ورچول ورلڈ اور ایکچول ورلڈ

انٹرنیٹ کی ایجاد نے دنیا بھر کو بدل کر رکھ دیا ہے۔انٹرنیٹ کے ساتھ مل کر کمپیوٹر اور موبائل کی جدید سے جدید ہوتی ٹیکنالوجی نے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔اس نئے دور کی خصوصیت یہ ہے کہ ہماری حقیقی دنیا کے ساتھ ایک اور دنیا وجود میں آ گئی ہے۔اس دنیا کو عام طور پر مجازی دنیا (Virtual World/Reality) کہا جاتا ہے۔

اس دنیا نے لوگوں کے لیے ان گنت مصروفیات پیدا کر دی ہیں۔ یہاں علم ہے۔ یہاں تفریح ہے۔ یہاں نئے تعلقات ہیں اور یقیناً زندگی کو سہل بنا دینے والی بہت سی آسانیاں ہیں۔ رفتہ رفتہ ہماری نئی نسلیں مادی دنیا سے زیادہ اس نئی دنیا سے متعلق ہوتی چلی جا رہی ہیں۔مختلف قسم کے آن لائن گیم بچوں اور نوجوانوں کو پورا پورا دن مصروف رکھتے ہیں۔سوشل میڈیا پر پیدا ہونے والی دوستیاں اور تعلقات بنیادی رشتوں سے زیادہ اہم لگنے لگتے ہیں۔ یہاں سے ہونے والی انفارمیشن بمبارٹمنٹ جو تحریر، تصویر، آواز اور ویڈیو کی شکل میں ہوتی ہے کسی اور سمت دیکھنے نہیں دیتی۔اس پر مہیا تفریحات بے انتہا اور اکثر اوقات بالکل مفت ہوتی ہیں۔

یہ ورچول ورلڈ اب ایک حقیقت ہے۔اس سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں نہ اس سے بچ کر جیا جا سکتا ہے۔ایسا کرنا ایک سنگین غلطی ہوگی۔لیکن اسی دنیا کا ہو کر رہ جانا اور مادی دنیا کی ذمہ داریوں سے نظریں پھیر لینا بھی اتنی ہی سنگین غلطی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں دنیاؤں کے درمیان ایک توازن قائم رکھا جائے۔ یہ یاد رکھا جائے کہ ہمیں جینا اپنی مادی دنیا میں ہے۔اس کی ذمہ داریوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔اس دنیا سے جو وقت بچے گا وہی ورچول ورلڈ کو دینا چاہیے۔اس کے برعکس رویہ اختیار کرنے کی صورت میں زندگی، رشتوں اور شخصیت ہر چیز کا توازن بگڑ جائے گا۔

انسانی جان اور ہمارا معاشرہ

اس دنیا میں کسی انسان کو ملنے والی سب سے بڑی نعمت زندگی ہے۔قرآن مجید نے انسانی جان کی حرمت کو اتنا بلند کر دیا کہ ایک انسانی جان کے بچانے کو پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف قرار دے دیا ہے (مائدہ 32:5)۔

بدقسمتی سے قرآن مجید ہمارے ہاں سب سے غیر اہم چیز سمجھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بات کو کوئی شخص سنجیدگی سے لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس کو اگر دیکھنا ہے تو مثال کے طور پر ہمارے صحت کے نظام کو دیکھ لیجیے جو انسانی جان بچانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ہمارا صحت کا نظام دنیا کا بدترین نظام ہے۔آبادی کے لحاظ سے سرکاری ہسپتالوں اور شفاخانوں کی تعداد اور گنجائش بہت کم ہے۔ جو ہسپتال ہیں وہاں عملہ، معیار اور اخلاقی رویے عموماً بہت بری سطح پر ہوتے ہیں۔ یہ نظام جتنے لوگوں کو بچاتا ہے، شاید اس سے زیادہ کو بے وقت رخصت کر دیتا ہے۔

پرائیویٹ ہسپتالوں کا معاملہ یہ ہے کہ اول تو یہ سہولت بڑے شہروں تک ہی محدود ہے۔ دوسرے یہ ہسپتال کم اور انسانی چمڑی اتارنے کے وہ مراکز زیادہ ہیں جن میں جانے والے مریضوں کے لواحقین زبردست مالی بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔یوں انتہائی مجبوری کے علاوہ لوگ یہاں کا رخ ہی نہیں کرتے۔اس کے علاوہ جو کچھ میڈیکل سہولیات دستیاب ہیں انھیں انتہائی مہنگے ٹیسٹوں اور ڈاکٹروں کی مہنگی فیسوں نے عام آدمی کی پہنچ سے بہت دور کر رکھا ہے۔ جبکہ جعلی اور ناقص ادویات کا عذاب اس کے علاوہ ہے جو آخر کار عام آدمی کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ ان سب چیزوں کے ساتھ سرکاری ہسپتال ہوں یا پرائیویٹ، آبادی کے لحاظ سے ان کی گنجائش اتنی کم ہوتی ہے کہ رش کی بنا پر ہسپتال جانا ایک مکمل خواری کا عمل ہے۔

انسانی جان کی بے وقعتی کی دوسری مثال ہمارا ٹریفک کا نظام ہے جو سالانہ لاکھوں لوگوں کی

موت، معذوری اور انھیں زخمی کر دینے کا ذریعہ ہے۔ مگر مجال ہے کہ اس عظیم جانی نقصان پر کسی کی پیشانی پر کوئی بل بھی آتا ہو۔ آپ نے شاید ہی کبھی کسی لکھاری کو اس موضوع پر لکھتے اور کسی مقرر کو بولتے ہوئے سنا ہوگا۔ اس ملک میں ہر روز کتنے گھروں میں قیامت آتی ہے، کتنے جوان ہلاک، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوتے ہیں، کتنی قیمتی جانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ مگر ستم یہ ہے کہ ایسے واقعات کی اب خبریں بھی نہیں آتیں سوائے اس کے کہ حادثے میں متعدد افراد ایک ساتھ ہلاک ہو جائیں۔

یہ دو مثالیں یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ انسانی جان کے معاملے میں ہم کس درجہ سنگدل، بے حس اور قاتلانہ سوچ کے حامل ہو چکے ہیں۔ اس کی ایک وجہ جیسا کہ پیچھے بیان ہوئی قرآن مجید کی باتوں کو سنجیدگی سے نہ لینا ہے۔ اس کی دوسری وجہ وہ باطل فلسفۂ تقدیر ہے جو ہر موت کے بعد ہمیں یہی تلقین کرتا ہے کہ اللہ کی یہی مرضی تھی۔ اس طرح کی باتیں کرنے والے نادان لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی مرضی بتا دی ہے کہ ایک انسانی جان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے۔

جہاں تک تقدیر کا معاملہ ہے تو قرآن مجید میں اس حوالے سے جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملات کا آخری اور حتمی فیصلہ اللہ تعالیٰ کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ اپنے اختیار سے پہلے بہت کچھ اختیار انھوں نے انسانوں کو دے رکھا ہے۔ انسان جب اس اختیار کو غلط استعمال کرتا ہے تو زمین ظلم اور فساد سے بھر جاتی ہے۔

جو قومیں دنیا میں انسانی جان کو بے وقعت کرتی ہیں وہ دراصل خدا کی زمین کو ظلم اور فساد سے بھر دیتی ہیں۔ ایسا کرنے والی کوئی قوم چاہے اسلام کی کتنی ہی علمبردار کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک مجرم قوم ہوتی ہے جسے جلد یا بدیر تباہ کر دیا جاتا ہے۔

کون دیتا ہے دینے کو دل چاہیے

ایک اندازے کے مطابق سائنسدانوں نے اب تک قابل مشاہدہ کائنات میں جو ستارے دریافت کیے ہیں ان کی تعداد دس ارب کھرب ہے۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے جس کو سمجھنا ہمارے ذہن کے لیے ممکن نہیں۔ انسانوں کی زبان میں کوئی ایک لفظ موجود نہیں جو اس تعداد کو بیان بھی کر سکے۔ جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے علاوہ بھی ستارے اس کائنات میں ہوں گے۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات جیسی چھ دنیائیں اور موجود ہیں اور یہ سب کی سب اہل جنت کے لیے تیار کی گئی ہیں جو ان کو انعام کے طور پر آخرت کی زندگی میں دے دی جائیں گی۔ قیامت کے بعد یہ تمام آسمان اور موجودہ زمین بھی ایک نئے قالب میں ڈھال کر اہل زمین کو رہنے، بسنے اور دیگر مقاصد کے لیے دے دیے جائیں گے۔

اس تمام کائنات کا تخلیق کرنے والا اللہ رب العزت ہے۔ اس نے کائناتوں کی ان بیکراں وسعتوں میں سے کچھ بھی اپنے لیے نہیں بنایا۔ اس نے یہ سب اپنے نیک بندوں کے لیے بنایا ہے۔ اپنے دعوے کی سچائی کے لیے قرآن مجید زمین و آسمان کو پیش کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اللہ کریم نے بے گنتی نعمتوں کی حامل بے مثال موجودہ دنیا انسانوں کو بلا معاوضہ دے رکھی ہے۔ دوسری طرف حقیقت یہ ہے کہ انسان اس کے بدلے میں اپنے رب کو کچھ نہیں دے سکتے۔

سخاوت بلاشبہ ایک اعلیٰ وصف ہے۔ یہ وصف صرف انھی لوگوں میں جنم لیتا ہے جن کا ظرف بہت اعلیٰ ہو اور جن کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کچھ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کی سخاوت اور شانِ عطا اتنی زیادہ ہے کہ انسان اس کا تصور کر کے دنگ رہ جاتا ہے کہ کوئی کس طرح دوسروں کو اتنا زیادہ دے سکتا ہے۔

ہمارے ہاں تو حال یہ ہے کہ جس کے پاس چار پیسے جمع ہو جائیں وہ ان پیسوں سے مزید

پیسے کمانے کے لیے انھیں کہیں نہ کہیں انویسٹ کرنے کی سوچنے لگتا ہے۔کوئی ضرورت مند آ جائے تو انسان اپنی مفلسی ،تنگدستی کی داستان کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ کاروبار میں گھاٹے کا رونا رونے لگتا ہے۔ مہنگائی کے ہاتھوں بے بس ہو جانے کی داستان سنانے لگتا ہے۔

کوئی سخی ہو بھی تو چند سو، چند ہزار یا چند لاکھ دے دیتا ہے۔کوئی عالمی سخی ہو تو اربوں ڈالر کما کر انھیں دوسروں کے لیے وقف کر دیتا ہے۔سب سے بڑی مثال مائیکروسوفٹ کے بانی بل گیٹس کی ہے جنھوں نے اپنی دولت میں سے 27 ارب ڈالرز رفاہی کاموں کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ مگر خدائے ذوالجلال کی سخاوت یہ ہے کہ اربوں کھربوں ستاروں پر پھیلی ہوئی سات کائناتیں اس نے انسانوں کو دے ڈالی ہیں۔اس جیسا کون ہو سکتا ہے؟

مگر دوسری طرف انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس سخی داتا کو جس نے سب کچھ اسے دینے کا فیصلہ کیا ہے، ماننے کا منکر ہے۔کوئی مانتا ہے تو اس طرح کہ خدا کی ساری عطا و بخشش کو غیروں کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے۔ مدد اور دستگیری سے لے کر خزانے اور اولاد تک وہ خدا کے غیر سے پانے کی کوشش کرتا ہے۔ایسے لوگ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر رہے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ہی ظلم کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی محرومی کا سامان آپ کر رہے ہیں۔

اس لیے کہ بہت جلد وہ دن آ رہا ہے جب انعام کی یہ جنت جس کی وسعت زمین سے لے کر آسمانوں تک ہوگی، انسانوں کے سامنے کر دی جائے گی۔ اپنی وفا کو تنہا ایک خدا کے لیے وقف کر دینے والے لوگوں کو بلایا جائے گا اور ان کی خالی جھولی میں اربوں کھربوں ستاروں کی بادشاہی ڈال دی جائے گی۔اللہ کو بن دیکھے اس کی حمد کے نغمے گانے والوں کو آسمان و زمین کا وارث بنا دیا جائے گا۔دوسری طرف غیر اللہ کو سب کچھ سمجھنے والے دیکھ لیں گے کہ جن کو وہ پکارتے تھے،ان کے ہاتھ میں ایک ذرہ کا اختیار بھی نہیں ہے۔

موت کے بعد زندگی

قرآن مجید کا ہر طالب علم طالوت اور جالوت کے اس واقعے سے واقف ہے جو سورہ بقرہ کی آیت نمبر 246 تا 252 میں بیان ہوا ہے۔اس واقعے میں دو جلیل القدر پیغمبروں کا ذکر بھی ہوا ہے۔ایک حضرت داؤد علیہ السلام کا جنھوں نے طالوت کی طرف سے لڑتے ہوئے جالوت کو شکست دی تھی۔جس کے بعد وہ بنی اسرائیل کی آنکھ کا تارہ بن گئے۔بادشاہ طالوت نے اپنی بیٹی کی ان سے شادی کردی۔وہ بنی اسرائیل کے اگلے حکمران بنے۔ان کے دور میں اور پھر ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل نے اپنی تاریخ کا سب سے بڑا عروج دیکھا۔اس عظمت کی داستان قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔

طالوت و جالوت کے اس واقعے میں ایک دوسرے نبی کا بھی تذکرہ ہوا ہے۔قرآن میں ان کا نام نہیں آیا۔صرف یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بنی اسرائیل نے ان سے ایک بادشاہ کو مقرر کرنے کا مطالبہ کیا تھا تاکہ اس کی سربراہی میں لڑکر وہ فلسطین کے مشرکوں کو شکست دے سکیں۔ قدیم صحیفوں میں قرآن کا بیان کردہ یہ واقعہ تفصیلاً موجود ہے اور وہاں ان پیغمبر کا نام حضرت سیموئیل بیان ہوا ہے۔

یہ وہ نبی ہیں جنھوں نے حضرت داؤد سے قبل بنی اسرائیل میں ایک زبردست اخلاقی انقلاب برپا کیا تھا۔اس انقلاب کا ذکر چند آیات قبل اسی سورہ بقرہ کی آیت 243 میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھر چھوڑ کر ان سے نکل کھڑے ہوئے؟ اس پر اللہ نے ان سے فرمایا کہ مردے ہو کر جیو۔(وہ برسوں اسی حالت میں رہے) پھر اللہ نے انھیں دوبارہ زندگی عطا فرمائی۔اس میں شک نہیں کہ

اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، مگر لوگوں میں زیادہ ایسے ہیں جو (اس کے) شکر گزار نہیں ہوتے۔‘‘

قرآن نے آگے چل کر طالوت اور جالوت کے واقعے میں یہی چیز بتائی ہے کہ ایمان و اخلاق کے لحاظ سے مردہ قوم جب زندہ ہوگئی تو اس کے نتیجے میں وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کا ذکر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے حوالے سے پیچھے بیان ہوا ہے۔ بائبل کے صحیفے سیموئل میں بنی اسرائیل کے اس اخلاقی زوال، اس کے نتیجے میں آنے والی سیاسی مغلوبیت، پھر سیموئیل نبی کی اصلاحی دعوت اور پھر ان کی فتح و غلبہ کی بڑی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

قرآن اور صحیفۂ سیموئیل میں بیان کردہ ان واقعات سے جو سب سے بڑا سبق سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے نام پر کھڑی ہوئی ایک قوم نے جب ایمان و اخلاق کے اصل دینی مطالبات کو چھوڑ دیا تو ان پر ذلت و مسکنت مسلط کر دی گئی۔ ایسے میں وقت کے نبی نے کسی سیاسی تبدیلی، سیاسی غلبے یا دشمنوں کو شکست دے کر ان سے اقتدار چھین لینے کو اپنا اصل مقصد نہیں بنایا بلکہ ایمان و اخلاق کی دعوت کو اپنا نشانہ بنا لیا۔ اس کے بعد بس بیس برس لگے اور ایک نسل پر محنت کر کے صورتحال مکمل طور پر بدل گئی۔

قرآن میں بھی یہ واقعہ اسی وقت سنایا گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم و بیش پندرہ برس کی ایمان و اخلاق کی دعوتی جدوجہد کے نتیجے میں انصار و مہاجرین کی شکل میں اعلیٰ ترین انسانوں کی ایک نسل کو تیار کر لیا تھا۔ چنانچہ اس ابتدائی مرحلے کے بعد ہی وہ وقت آیا کہ مسلمانوں نے بدر میں مشرکین مکہ کو شکست دی۔ عرب پر اسلام کا غلبہ ہوا اور پھر پوری متمدن دنیا پر دین حق چھا گیا۔ یہ ایک قوم کے ایمان و اخلاق کی دعوت کو قبول کرنے کا وہ نتیجہ تھا جو تاریخ کے صفحات پر پوری طرح رقم ہے۔

بنی اسرائیل کے جانشین مسلمان پچھلے تین سو برس سے اپنا کھویا ہوا سیاسی اقتدار بحال کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔اس کے ساتھ مسلمانوں نے غیر سیاسی میدانوں میں بھی بھرپور جدوجہد کی۔مگر میدان بدلنے کے باوجود یہاں ایمان واخلاق کی اصل قرآنی دعوت کو مقصد بنا کر کام نہیں کیا گیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ غلبہ واقتدار کا خواب آج کے دن تک شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اگلے تین سو برس بھی مسلمانوں نے اپنی غلطی کو نہیں سمجھا اورایمان واخلاق کی اس جدوجہد کو اختیار نہیں کیا جو انبیاء کی اصل جدوجہد ہوتی ہے تو ان کی ساری کدوکاوش بے ثمر ہی ثابت ہوگی۔اس کے برعکس عملی طور پر مردہ ہوجانے والے بنی اسرائیل کی داستان یہ سبق سناتی ہے کہ صرف بیس برس کی ایمان واخلاق کی دعوت کتنے غیر معمولی نتائج پیدا کرسکتی ہے۔

آج ہم پر اجتماعی طور پر موت طاری ہے۔اس موت سے نکلنے اور زندگی پانے کا ایک ہی راستہ ہے۔ایمان واخلاق کی دعوت کو پوری طرح اختیار کرنا۔ یہ راستہ ہمیں خود ہمارے پروردگار نے بتایا ہے جو قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے کرتا ہے۔ یہ راستہ انبیاء علیھم السلام کا راستہ ہے۔مگر ہم کیسے بدنصیب لوگ ہیں کہ اللہ اوراس کے نبیوں کا بتایا ہوا راستہ چھوڑ کر دنیا کے انقلابی لیڈروں کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور ختم نہ ہونے والی ذلت اور رسوائی کا شکار ہیں۔

ابو یحییٰ

اسلام اور لونڈی غلام (7)

لونڈی اور غلاموں کے حوالے سے اس سلسلہ تحریر کی پچھلی قسط میں ہم نے اس بات کو سمجھا تھا کہ زمانہ قدیم میں غلامی اور خاص طور پر لونڈیوں کا تصور موجودہ دور کے ایک بہت بڑے ظلم یعنی Sex Trafficking جیسا ہرگز نہیں تھا۔ مزید یہ بات بھی واضح کی گئی تھی کہ اسلام نے لونڈی غلاموں کی آزادی کا اختیار ان کے ہاتھ میں دے کر غلامی کو ایک لازمی جبر کی حیثیت سے ختم کر دیا تھا۔ یہ کام مکاتبت کے اس قانون کی شکل میں کیا گیا تھا جو سورہ نور (33:24) میں بیان ہوا ہے۔ آج ہم اس سوال کا جواب دیں گے کہ مالکوں کا لونڈیوں سے جنسی تعلق قائم کرنا کیا ان پر کیا جانے والا ایک جبر تھا؟ ایسا تھا تو اسلام نے اس جبر کو کیوں باقی رکھا؟

زمانہ قدیم میں لونڈیوں کے ساتھ تعلق کی حیثیت

زمانہ قدیم کے لونڈی غلاموں کے بارے میں یہ بات ہم بار بار واضح کر چکے ہیں کہ غلامی کا ادارہ عملی طور پر وہی حیثیت رکھتا تھا جو موجودہ زمانے میں ملازمت کے ادارے یا سروس انڈسٹری کو حاصل ہے۔ کسی شخص کو جب غلام بنایا جاتا اور اس حیثیت میں اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی تو پیش نظر بات اس غلام سے خدمت لینا ہوتا تھا۔ لونڈی کا معاملہ بھی اس سے جدا نہ تھا۔ ان کی اصل حیثیت خادماؤں کی تھی۔ لیکن قبائلی دور اور زرعی سماج کے بعض حقائق کے علاوہ انسانی نفسیات کے بعض پہلو ایسے ہیں جن کی بنا پر یہ رواج عام ہو گیا تھا کہ لونڈیوں کے مالک ان سے بلا روک ٹوک تمتع کیا کرتے تھے۔

زمانہ قدیم کا زرعی سماج ایک مردانہ سماج تھا۔ اس میں دولت، طاقت اور اقتدار کا مرکز مرد

کی ذات تھی۔ ایک طرف لونڈی غلاموں کی کثرت اس کی قوت وحشمت کی علامت ہوتی تو دوسری طرف زیادہ اولاد اس کی تقویت کا سبب بنتی۔ بیویوں کے علاوہ لونڈیاں وہ ذریعہ تھیں جو دیگر خدمات کے ساتھ اولاد پیدا کرنے کی خدمت بھی سرانجام دیتی تھیں۔ مزید براں یہ کہ عورتیں بہرحال مردوں کے لیے ہمیشہ سے باعثِ کشش رہی ہیں۔ ایسے میں لونڈیوں کی خریداری میں یہ محرک بہرحال موجود ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ یہی وہ پس منظر ہے کہ غلاموں کے برعکس جو صرف خدام تھے، لونڈیوں سے تعلق قائم کرنا ایک عمومی رواج بن گیا اور سماج نے اس تعلق کو اسی طرح جائز سمجھ لیا جیسے بیویوں سے تعلق کو ایک جائز تعلق سمجھا جاتا ہے۔

اصلاح احوال کے لیے اسلام کی کوشش

اسلام کو غلامی اور اس کے متعلق یہ رواج ورثے میں ملا۔ غلامی کی طرح یہ رواج بھی اسلام کی اس تعلیم کے عین خلاف تھا جو آزادی، عدل اور انسانیت کی علمبردار ہے۔ لیکن ہم پیچھے یہ بیان کر چکے ہیں کہ وہ کیا حالات تھے جن میں زمانہ قدیم میں غلامی کو بیک جنبش قلم ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ ہمارے استدلال کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے بعض لوگ یہ مان تو لیتے ہیں کہ غلامی کو ایک دم سے ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر ان کے نزدیک قرآن مجید کا مالکوں کو اپنی لونڈیوں سے تمتع کی اجازت دینا معاذ اللہ ایک ظالمانہ فعل تھا جس کی کوئی توجیہہ و تاویل نہیں کی جا سکتی۔

ہم اس اعتراض کا جواب دیں گے، مگر اوپر بیان کردہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہے کہ یہ اسلام نہیں تھا جس نے اس رواج کا آغاز کیا۔ اسلام کو یہ صورتحال ورثے میں ملی تھی۔ اسلام نے اس صورتحال کو اس طرح بہتر کرنے کی کوشش کی کہ ایک طرف اس نے مالکوں کو ابھارا کہ اپنے لونڈی غلاموں کا نکاح کر دیں اور دوسری طرف اس نے عام لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ آزاد خواتین سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو مومن لونڈیوں سے نکاح کر لیں۔ ارشاد

باری تعالیٰ ہے:

''اور اپنے ان غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کر دو جو اس (نکاح کی ذمہ داریاں اٹھانے) کی صلاحیت رکھتے ہوں۔''، (النور 32:24)

''اور مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرنا۔ ایک مومن لونڈی ایک (آزاد) مشرکہ سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں بھلی لگے۔ اور مشرکوں کو جب تک وہ ایمان نہ لائیں (اپنی عورتیں) نکاح میں نہ دو۔ ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے۔ اگرچہ وہ تمھیں بھلا لگے''، (بقرہ 221:2)

''اور جو شخص تم میں سے مومن آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو انھیں چاہیے کہ تمھاری ان مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لیں جو تمھارے قبضے میں ہوں۔ اور اللہ تمہارے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے۔ تم آپس میں ایک دوسرے کے ہم جنس ہو تو ان لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں سے اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو اور دستور کے مطابق ان کا مہر بھی ادا کر دو۔''، (نساء 25:4)

یہ ہدایات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام نے اس صورتحال کی سنگینی کو کم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن یہ اعتراض بہرحال ابھی باقی ہے کہ اسلام نے بالکلیہ مالکان کو اس تعلق سے منع کیوں نہیں کیا۔

اسلام پر اعتراض کا جواب

اس اعتراض کی کمزوری کو سمجھنے کے لیے دور غلامی کے بعض حقائق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے کی بنیادی حقیقت جسے ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں کہ قدیم سماج میں لونڈیوں سے جنسی تعلق ان کی غلامی کا ایک ضمنی نتیجہ تھا۔ یعنی اصل خرابی غلامی کا ادارہ تھا۔ جب تک یہ پہلا جبر

باقی تھا دوسرے جبر کو ختم کرنا نا قابل عمل تھا۔ اسلام ایسا کوئی حکم جاری بھی کر دیتا تو عملاً یہ قابل عمل نہیں تھا۔ کسی طرح اس حکم کی پابندی کرا بھی دی جاتی اور یقیناً بہت سے مالکان اس کی پابندی کرتے بھی، لیکن اس کے نتیجے میں خود لونڈیوں کے لیے عملی طور پر مسائل پیدا ہو جاتے۔ یہ وہ دوسری حقیقت ہے جسے تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

تعلق زن وشو جس طرح مرد کی ایک ضرورت ہے، یہ خاتون کی بھی ایک انسانی ضرورت ہے۔ لونڈی بن کر یہ ضرورت پوری کرنا یقیناً کوئی آئیڈیل نہیں، مگر غلامی کے دور جبر میں مالکان پر اس تعلق کے قائم کرنے پر پابندی لگا دی جاتی تو ان کے پاس تو بہر حال بیوی کا راستہ باقی رہتا، مگر لونڈیوں کے پاس شوہر کرنے کا راستہ بہت مشکل تھا۔

پیچھے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ لوگوں کو لونڈیوں سے نکاح کی ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ بار بار توجہ دلائی جا چکی ہے کہ معاشرتی عرف اور رواج کے خلاف جانا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ اوپر نقل کردہ سورہ نساء کی آیت سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ لوگ عام طور پر لونڈیوں سے نکاح پر بالکل تیار نہیں ہوتے تھے۔ اسی پس منظر میں لوگوں کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ وہ تمھاری ہم رتبہ نہ سہی ہم جنس ضرور ہیں۔ اس لیے زنا میں پڑنے کے بجائے ان سے نکاح کرنا ایک بہتر راستہ ہے۔

یہ توجہ دلانے کا سبب یہ تھا کہ لونڈیوں کو معاشرے میں اتنا کمتر سمجھا جاتا تھا کہ ایک آزاد شخص ان سے نکاح کرنا اپنے لیے باعث عار سمجھتا تھا۔ خود لونڈیاں بھی اخلاقی طور پر کچھ بہتر مقام پر نہ تھیں۔ یہ بات ہمیں سورۂ نساء کی مذکوہ بالا آیت (25:04) کے اگلے حصے سے معلوم ہوتی ہے جہاں اخلاقی تربیت میں کمی کے پیش نظر شادی شدہ لونڈیوں کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ اگر نکاح کے بعد ان سے زنا کا ارتکاب ہو جائے تو ان کی سزا ایک آزاد عورت کے مقابلے میں آدھی ہو گی۔

لونڈیوں کے ساتھ شادی کرنے میں ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ حقوق زوجیت اور حقوق ملکیت میں ایک نوعیت کا تصادم پیدا ہوتا تھا۔ ایک طرف مالک ہوتا جس کی وہ لونڈی خادمہ تو بہر حال رہتی اور دوسری طرف شوہر ہوتا جس کے اپنے حقوق اور تقاضے ہوتے۔ یہ وہ پس منظر تھا جس میں آزاد لوگ لونڈیوں سے شادی کرنے پر تیار نہ تھے۔ رہے غلام تو اول تو ان کی اپنی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ اپنے بل بوتے پر ایک بیوی کی ذمہ داریاں اٹھا سکیں۔

یہ وہ عملی حالات تھے جن میں مالکان پر لونڈیوں کے ساتھ تعلقات پر پابندی لگا دی جاتی تو بہت سی لونڈیاں ساری زندگی کے لیے ایک انسانی ضرورت پوری کرنے سے محروم رہ جاتیں۔ خیال رہے کہ عورت کے معاملے میں یہ نفسیاتی ضرورت ماں بننا بھی ہوتا ہے جو ظاہر ہے کہ اس تعلق کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ پورا پس منظر آج کے کسی معترض کی نگاہ سے اوجھل ہو سکتا ہے، مگر اس زمانے کی لونڈیاں ان سارے حقائق سے واقف تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ کسی دوسرے غلام کے مقابلے میں ان کا مالک ایک بہتر انتخاب ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو لونڈی کا مالک سماجی اور مالی طور پر زیادہ مستحکم ہوتا تھا۔ دوسرے اس سے ہونے والی اولاد بہر حال ایک آزاد انسان کی آزاد اولاد ہوتی اور سب سے بڑھ کر مالک سے اولاد ہونے کی شکل میں مالک کے بعد لونڈی کی آزادی کا حکم دے دیا گیا تھا اور ان کی فروخت پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

چنانچہ استثنائی معاملات کے سوا جو عام طور پر عشق و محبت کے ہوتے تھے، لونڈیاں غلاموں کے بجائے مالکوں کے بچوں کی ماں یا ام ولد بننے کو ترجیح دیتی تھیں۔ اس دور کی لونڈیاں یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ اگر اُنھوں نے کسی کے ساتھ زن و شو کا تعلق قائم کرنا ہی ہے تو ایک دوسرے غلام سے بہتر ہے کہ وہ ان کا مالک ہو جو انھیں بہتر تحفظ بھی دے سکتا تھا اور ان کی تمام

ضروریات بھی پوری کرسکتا تھا۔

یہ پورا پس منظر اگر واضح ہے تو یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ اسلام کا کوئی ایسا حکم جاری کرنا جس میں مالکوں پر پابندی لگادی جاتی کہ وہ اپنی لونڈیوں سے تعلق زن وشو قائم نہ کریں تو یہ حکم عملی طور پر قابل عمل نہ ہوتا۔ کسی نہ کسی طرح اس پر عمل کرا بھی دیا جاتا تو لونڈیوں کے لیے نکاح کا کوئی دوسرا دروازہ آسانی سے نہیں کھلا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک طرف ان کی اخلاقی صورتحال مزید خراب ہوتی اور دوسری طرف وہ ان فوائد سے محروم ہو جاتیں جو ام ولد یا مالک کے بچے کی ماں بننے کی شکل میں انھیں حاصل ہوتے۔ ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام نے مکاتبت کی شکل میں ان لونڈیوں کے لیے آزادی کا دروازہ پہلے ہی کھول دیا تھا جسے استعمال کر کے وہ مالک سے اپنی جان چھڑا سکتی تھیں۔ اس قانون کے بعد مالکوں پر کوئی غیر فطری پابندی عائد کرنا ایک غیر ضروری امر تھا۔

اس ضمن کی آخری بات یہ ہے کہ اس دور کے سماجی حالات میں ایک مالک کا اپنی لونڈی سے تعلق قائم کرنا سماجی طور پر ایسا ہی قابل قبول عمل تھا جیسا کہ آج ایک شوہر کا اپنی بیوی سے تعلق قائم کرنا ہے۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ سیکس ٹریفکنگ قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ جو چیز غلط اور ظلم تھی وہ یہ تھی کہ لونڈیوں کو قحبہ گری کا پیشہ کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کی اسلام نے سختی سے ممانعت کر دی، (33:24)۔

اس ضمن کا ایک سوال البتہ باقی ہے کہ یہ کوئی آئیڈیل صورتحال نہ تھی تو کم از کم پیغمبر علیہ السلام کی اپنی خانگی زندگی میں کسی خاتون کا اس حیثیت میں ذکر نہ آتا۔ اس اعتراض پر گفتگو ان شاء اللہ اگلی دفعہ ہوگی۔

ابو یحییٰ

اللہ تعالیٰ سے بات کرنے کا طریقہ

[نوٹ: ادارہ انذار کی طرف سے ان سوالات کا جواب ثاقب علی صاحب نے دیا جبکہ حمزہ طارق صاحب نے اس جواب کو آڈیو سے تحریر کے قالب میں ڈھالا ہے۔]

سوال:

السلام علیکم سر

1۔ اللہ پاک سے بات کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ بہتوں نے بتایا ہے کہ قرآن مجید کلام پاک ہے اللہ پاک سے بات کرنے کا طریقہ بھی، پر ہم ناقص عقل، کج فہم، کم علم کے ساتھ اللہ پاک سے کیے گئے سوال کا جواب کہاں سے لیں؟ کیسے سمجھیں اللہ پاک کے جواب کو؟ براہ کرم رہنمائی کریں۔

2۔ انسان غم میں ہی کیوں اپنے خدا کو یاد کرتا ہے؟ خوشی میں وہ شدت کیوں پیدا نہیں ہوتی جو غم میں ہوتی ہے؟ انسانی فطرت ایسی کیوں ہے؟ شکریہ۔ بنت اسلم

جواب:

وعلیکم السلام۔

1۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بات کر رہے ہیں یا ہم اللہ تعالیٰ سے بات کر رہے ہیں، تو اس سے مراد ویسی بات چیت نہیں جو دو انسانوں کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ غیب میں ہیں، وہ اگر ایسے ہی ہم سے بات چیت کرنا شروع کر دیں جیسے

ہم انسان آپس میں کرتے ہیں تو امتحان ختم ہو جاتا ہے۔قرآن پاک پڑھتے وقت جب آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کام کے کرنے یا اس سے رک جانے کا حکم دیا ہے،تو اسے خدا کی آپ کے ساتھ گفتگو سمجھیں۔اب آپ خدا سے کیسے مخاطب ہوں، اس کے لیے نماز کو سمجھ کر پڑھیں، جو دعائیں کریں انھیں پورے شعور کے ساتھ مانگیں جیسے ایک زندہ ہستی کے سامنے آپ اپنی درخواست پیش کر رہے ہیں۔کچھ دعائیں یا یوں کہیں آپ کی کچھ باتیں اسی وقت مان لی جائیں گی، کچھ تھوڑے وقت کے لیے مؤخر کر دی جائیں گی اور کچھ آپ کے حق میں بہتر نہ ہونے کی وجہ سے قبول تو نہیں کی جائیں گی، لیکن ان کا اجر آپ کے لیے محفوظ کر لیا جائے گا۔

2۔ فطری طور پر انسان خوشیوں اور آسائشوں کو پسند کرتا ہے اور نتیجتاً خدا سے لاپروا ہو جاتا ہے۔جس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایسی کیفیت میں خود کو کسی سہارے کا محتاج محسوس نہیں کر رہا ہوتا۔ لیکن جب اس پر کوئی تکلیف آ جاتی ہے،تو وہ سہارا تلاش کرتا ہے۔خدا سے بڑھ کر اسے کوئی سہارا معلوم نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے وہ غم کی کیفیت میں خدا کی طرف جھک جاتا ہے۔لیکن ایک بندہ مومن سے خوشی میں شکر اور غم میں صبر کا رویہ مطلوب ہے۔

مولانا وحیدالدین خان

صحیح نقطۂ آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے جب مکہ میں تھے تو وہاں کے سرداروں نے آپ کو حکومت کی پیش کش کی۔ انہوں نے کہا: اگر تم حکومت چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنے اوپر حاکم بنانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں تمہارے اوپر حکومت نہیں چاہتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جواب سے اسلامی تحریک کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اسلامی تحریک کا نقطۂ آغاز حکومت یا سیاسی اقتدار نہیں ہے، بلکہ اسلامی تحریک کا اصل نقطۂ آغاز فرد کی شخصیت میں تبدیلی لانا ہے، ایک ایک فرد کے ذہن کی تشکیل نو کرنا ہے۔

اسلامی تحریک کا فارمولا دو نکات پر مشتمل ہے ۔۔۔۔ فرد کی شخصیت میں تبدیلی لانا، اور پولیٹکل سسٹم کے معاملے میں حالت موجودہ کو تسلیم کر لینا۔

اسلامی تحریک کی یہی فطری ترتیب ہے۔ اگر اس ترتیب کو بدل دیا جائے، یعنی اگر پولیٹکل سسٹم کو بدلنے سے تحریک کا آغاز کیا جائے تو سو سال کی جدوجہد کے بعد بھی کوئی مثبت نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ فرد کی تبدیلی سے آغاز کر کے نظام کی تبدیلی تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اگر نظام کی تبدیلی سے آغاز کیا جائے تو ایسی تحریک کسی انجام تک پہنچنے والی نہیں۔ ایسی تحریک صرف تباہی میں اضافہ کرے گی، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

فرد کے اندر ذہنی تبدیلی سے تحریک کا آغاز کرنے کی صورت میں فی الفور تحریک کو مثبت آغاز مل جاتا ہے۔ لیکن سسٹم سے آغاز کرنے کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ آخر کار تحریک ایک بند گلی میں پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اس کے پیچھے بھی اندھیرا ہوتا ہے اور اس کے آگے بھی اندھیرا۔

مولانا محمد ذکوان ندوی

اصلاحی یا اصطلاحی عالم

آج زکوٰۃ کے موضوع پر مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ کے فارغ التحصیل ایک 'اصلاحی' عالم کی تحریر پڑھتے ہوئے ایک خیال آیا، وہ یہ کہ ایک سچے عالم سے جو چیز مطلوب ہے، وہ اُس کا ''اصلاحی'' ہونا ہے، نہ کہ محض اصطلاحی ہونا۔

عام طور پر عالم کی اصطلاح اس شخص کے لیے استعمال ہوتی ہے جو کسی مدرسے کا فاضل اور کسی سند کا حامل ہو۔ لفظ عالم کا یہ اصطلاحی استعمال اپنا ایک موقع محل رکھتا ہے، مگر درحقیقت عالم کا مقام و منصب جن چیزوں کا تقاضا کرتا ہے، ان کو پورا کرنے والا شخص ہی عالم کہلانے کا مستحق ہے۔

اصل عالم کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ عقل و فطرت اور قرآن و سنت کی روشنی میں لوگوں کے فکر و عمل کی اصلاح کرے، وہ بلا خوفِ لومۃَ لائم 'مذہب' کے نام پر رائج تمام چیزوں کا جائزہ لے، وہ حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دے، وہ اصلاح کا عمل اِس جرأت اور حکمت کے ساتھ انجام دے کہ باطل سرے سے اپنی بنیاد کھو دے اور باطل کی کوئی بھی مقدس یا غیر مقدس دیوار ایسی باقی نہ رہے جو مکمل طور پر ڈھا نہ دی گئی ہو۔ اِس طرح وہ پورے معنوں میں قرآن کے اِن الفاظ کا مصداق بن جائے: 'اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ' (ہود ۱۱: ۸۸) یعنی میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں اور بس!

'اصلاح' کا مطلب فکر و عمل کے فساد سے نکال کر لوگوں کے اندر حقیقی دینی روح اور قوتِ عمل بیدار کرنا ہے۔ ایک سچا عالم وہی ہے جو اِس معنی میں 'اصلاحی' عالم ہو، نہ کہ معروف معنی میں صرف ایک اصطلاحی عالم۔ محض اصطلاحی عالم، عالم نہیں، بلکہ صرف ایک سند یافتہ جاہل ہے۔

شفقت علی

بچوں کی تربیت میں پانچ احتیاطیں

بچوں کی تربیت نہایت حساس اور احتیاط طلب معاملہ ہے۔ یہ معاملہ اس وقت بگڑ جاتا ہے جب ہم والدین بے احتیاطی اپناتے ہیں۔ یہ بے احتیاطی کیا ہے، کیسے وقوع پذیر ہوتی ہے اور اِس کا سدباب کیا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

1۔ کانشیئس بنیں، اوور کانشیئس نہیں:

ہمارے ہاں زیادہ تر والدین دو طرح کے ہوتے ہیں: پہلے بچوں کی تربیت سے لاپرواہی برتنے والے (no conscious) اور دوسرے حد سے زیادہ پروا کرنے والے (over conscious)۔ لاپرواہی برتنے والے والدین اپنے بچوں کی مادی ضروریات تو پوری کر دیتے ہیں مگر اپنی حد سے زیادہ مصروفیات کی بنا پر اُن کی تربیت سے غافل رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں یہ کام مہنگے سکولوں کا ہے جن میں ہمارا بچہ پڑھ رہا ہے۔ دوسری قسم کے والدین وہ ہیں جو بچوں کی تربیت کو دردِ سر بنا لیتے ہیں اور خود بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ایسے والدین بچوں سے غیر حقیقی توقعات قائم کر لیتے ہیں اور اپنے بچوں کا مقابلہ دوسرے بچوں سے کرتے ہیں۔ یہ رویہ نہ صرف والدین بلکہ بچوں کی صحت کے لیے بھی خطرناک ہے۔ ان دو رویوں کا حل فقط اعتدال پسندی اور حقیقت پسندی ہے۔

2۔ رویہ فرینڈلی رکھیں، فرینکلی نہیں:

ہمارے ہاں والدین یا تو بچوں سے معاملہ کرتے ہوئے بالکل روایتی طریقہ استعمال کرتے ہیں یعنی سختی و جبر یا پھر بہت ہی لچک دے جاتے ہیں یعنی فرینک (frank) ہو جاتے ہیں۔ پہلا رویہ بچوں میں ضد اور بغاوت پیدا کرتا ہے تو دوسرا اُن کی نظر میں آپ کا وقار پامال کر دیتا

ہے۔ یہاں بھی ضرورت ہے کہ اعتدال پر مبنی رویہ اپنایا جائے۔

3۔ غیر مستقل مزاجی سے بچیں:

بچوں کی تربیت دنوں کا نہیں بلکہ سالوں کا معاملہ ہے۔ کیسے اور کون سی خوبیاں بچے میں کب پیدا کرنی ہیں، کس برائی سے بچے کو کیسے بچانا ہے اس کے لیے مکمل منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یہاں غیر مستقل مزاجی سارے تربیتی عمل کو برباد کر دیتی ہے۔

4۔ گفتار نہیں، کردار سے سکھائیں:

تربیت تقریر کرنے یا لیکچر دینے کا نام نہیں بلکہ اپنے کردار سے بچوں کو متاثر کرنے کا نام ہے یعنی بچے وہی کچھ سیکھتے ہیں جو آپ کرتے ہیں نہ کہ وہ جو آپ کہتے ہیں۔ اگر آپ کوئی عادت بچوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں یا کسی بری عادت سے اُنہیں بچانا چاہتے ہیں تو اُسے اپنے کردار کے ذریعے سکھائیں نہ کہ محض حکم نامے سے۔

5۔ پہلے سمجھیں پھر سمجھائیں:

ہم والدین بچوں کے احساسات، جذبات اور انفرادی اختلافات جانے بغیر بچوں سے معاملہ کرتے ہیں جو تربیت کے عمل میں بہت خطرناک ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تربیت سمجھانے کا نام ہے یا نصیحتیں کرنے کا نام ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تربیت سمجھانے سے زیادہ بچے کو سمجھنے کا عمل ہے۔ جب آپ بچے کو سمجھ جاتے ہیں، اُس کی بات کو غور سے سننا شروع کر دیتے ہیں تو تربیت کا آدھا عمل پورا ہو جاتا ہے۔

محمد ثوبان

تضاد

کل میں بازار سے گزر رہا تھا۔ایک شخص جو وضع قطع سے اچھے خاصے مذہبی لگ رہے تھے، میرے قریب سے گزرے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی موٹر سائیکل ایک دوسرے شخص کی موٹر بائیک سے ٹکرا گئی۔ پھر وہی لفظوں کی روایتی جنگ شروع ہوئی جس میں ایک شخص دوسرے کو قصوروار ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بات بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جاتی ہے۔ مذہبی وضع قطع والے شخص کے آخری جملے نے مجھے یہ تحریر لکھنے پر مجبور کر دیا۔ مذہبی شخص کا آخری جملہ یہ تھا ''کلین شیو والے ہوتے ہی اس طرح کے ہیں''۔آسان لفظوں میں اُنہوں نے انسان کے ظاہری حلیے کو اچھائی اور برائی کا معیار ثابت کیا۔

معزز قارئین! یہ نفسیات ہمارے معاشرے میں کثرت سے پائی جاتی ہے ہم ایک خاص طرح کی وضع قطع کو مذہب کی نشانی سمجھتے ہیں۔جس شخص نے وہ خاص وضع قطع اختیار نہ کی ہو، اُس کا ایمان ہماری نظروں میں مردود ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری مذہبی جماعتیں جو دین کے نام پر بنی ہیں وہ بھی شخصی تربیت کے بجائے ایک خاص طرح کا حلیہ بنانے کو دینداری سمجھتی ہیں۔ لیکن اسلام دینِ فطرت ہے۔ اِس میں ہر ظاہری حکم کا ایک باطنی پہلو بھی ہے جو دین اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔اگر ہم ظاہری طور پر کچھ نیکیاں کرتے ہیں تو وہ تب ہی بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوں گی جب اُن کی اصل اسپرٹ ہمارے اندر موجود ہوگی۔ چند سجدے کر لینے کا نام اسلام نہیں بلکہ اپنے جسم کا ذرہ ذرہ فرمانِ الٰہی کے تابع کر دینا اسلام ہے۔

دین کا مقصد تزکیۂ نفس ہے،انسان کے اخلاقی وجود کی تطہیر ہے۔یہی وہ چیز ہے جسے اپنے مقصد کے طور پر ہمیشہ سامنے رکھنا ضروری ہے۔

خطیب احمد

محبت

محبت ایک ایسا لفظ ہے جس کی دنیا بھر میں سینکڑوں تعریفیں کی گئی ہیں مگر یہ لفظ ہر طرح سے بیان ہو جانے کے بعد آج بھی اپنے اندر مفاہیم، استعمالات اور اطلاقات کی ایک دنیا سموئے ہوئے ہیں۔ ان اطلاقات میں سے چند اہم درج ذیل ہیں۔

والدین کی اپنے بچوں سے محبت والدین کی ضروریات کو محدود کر دیتی ہے وہ اپنے بچوں کو خود سے بہتر مستقبل دینے کے لیے اپنا پیٹ کاٹتے ہیں، پرانے کپڑے، جوتے پہن لیتے ہیں اور خصوصاً ماں انتہائی غربت میں اپنے جگر گوشے کو اپنا کھانا بھی دے دیتی ہے اور خود بھوکی رہ لیتی ہے۔ یہ محبت کی ایک قسم ہے جس کا ہم اپنی زندگی میں روز مشاہدہ کرتے ہیں۔

ایک محبت وہ ہے جو مرد و زن ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ بہن بھائی اور دیگر رشتوں میں بھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اپنے شہر، قوم، قبیلے، صوبے، ملک، مسلک و مذہب کے افراد سے بھی انسان کو محبت ہوتی ہے۔ کہیں پردیس میں کوئی اپنے گاؤں یا شہر کا فرد مل جائے تو دل خوش ہو جاتا ہے اور ایک ٹھنڈ سی پڑ جاتی ہے۔

ان تمام محبتوں اور تعلقات میں لوگ ایک دوسرے کی پسند و ناپسند کا خیال کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خیال کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ قریبی رشتوں کی محبت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ دوسرے کو کون سی چیز پسند ہے۔ خاص کر معاملہ مرد و زن کی محبت کا ہو تو انسان اپنی پوری شخصیت محبوب کی پسند کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ کئی لوگوں کو محبت ہو جانے پر نمازی بنتے بھی دیکھا گیا ہے اور بہت سے اس محبت میں اپنی وضع قطع بدل لیتے ہیں۔ ایک محبت کرنے والا شخص عموماً دنیا و مافیہا سے کٹ جاتا ہے اس کی سوچوں میں ہر وقت اس کا محبوب ہی بستا ہے وہ

اس کے خیالوں میں گم اپنی زندگی کے سب رنج والم بھول جاتا ہے۔

اوپر بیان کردہ چند مثالیں ہیں ہم میں سے ہر کوئی کسی نا کسی شکل میں ایک بار یا ایک سے زائد بار محبت ضرور کرتا ہے۔ اپنے بہن بھائیوں سے، اپنے بچوں سے، بیوی سے اور عموماً جس سے محبت کی جاتی ہے وہ فرد دکھ بھی دیتا ہے۔ مگر ہم انسان اس دنیا کی محبتوں میں ایسے کھوئے ہوئے ہیں کہ ہماری محبت کی جو ذات حقیقت میں حق دار ہے اس سے کبھی ہمیں پیار ہوا ہی نہیں۔ اسے ہم نے کبھی اپنا محبوب بنایا ہی نہیں۔ وہ ذات ہر لمحہ ہم سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ جب ہم اس ذات سے محبت کر لیں گے تو اس دنیا کی محبتیں ہیچ لگنے لگیں گی وہ سب کچھ جو ہمارے حق میں بہتر ہوا مل جائے گا۔ مگر اپنے اللہ سے اظہار محبت کرنے والے بہت ہی کم ہیں۔ ہمارے ہاں غیر اللہ سے محبت کا دم بھرنے والے کروڑوں ہیں مگر میں نے کسی کو یہ کہتے کم ہی سنا ہے کہ وہ اللہ سے پیار کرتا ہے۔

وہ خدائے واحد ہمیں کیسا دیکھنا چاہتا ہے، ہمارا سونا جاگنا، خوشی غمی، لین دین، لوگوں سے معاملات کیسے ہوں؛ اس نے سب کچھ بتایا ہوا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اگر میری محبت میں یہ چند روزہ زندگی گزار لو گے تو جب ''اصل زندگی شروع ہوگی'' تب دیکھو گے اس کا اجر کیا ہے۔ ابدی جنت اور نہ ختم ہونے والی نعمتیں ان لوگوں کا مقدر بن جائیں گی جو خدا کی محبت میں آج اپنے آپ کو بدل لیں گے اور اپنے آپ کو اپنے محبوب کی پسند و ناپسند کے مطابق ڈھال لیں گے۔ اور جو لوگ اس دنیا کی محبتوں میں ہی اپنی عمر گزار گئے کبھی خدا سے محبت نہ کی، نہ اس کی طرف رجوع کیا، نہ اپنے شب و روز بدلے، نہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کیا تو وہ قیامت کے دن بڑے ہی خسارے میں ہوں گے۔

جاوید چوہدری

اصل اثاثہ

وہ پامسٹ ہمیں لندن میں یوں ہی چلتے پھرتے مل گیا تھا، میں اور میرا دوست، ہم دونوں راستہ بھٹک گئے تھے اور ہم اندازے سے آکسفورڈ اسٹریٹ تلاش کررہے تھے، ہم ایڈریس سمجھنے کے لیے ایک کافی شاپ میں چلے گئے۔

کافی شاپ کے سامنے مینیو کا وائٹ بورڈ لگا تھا اور اس وائٹ بورڈ کے ساتھ گلی کے فرش پر ایک بلیک بورڈ پڑا تھا جس پر ہاتھ کی تصویر بنی تھی اور تصویر کے نیچے لکھا تھا ''اگر آپ کی جیب میں بیس پاؤنڈز ہیں تو آپ اپنے مقدر سے زیادہ دور نہیں ہیں'' ہم دونوں مسکرانے پر مجبور ہو گئے کیونکہ ہمارے پاس بیس بیس پاؤنڈز تھے، ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے، یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کی چاروں دیواروں پر کتابوں کے ریک تھے اور ان ریکس میں ہزاروں کتابیں تھیں۔

کمرے کے عین درمیان میں رائٹنگ ٹیبل تھی، اس رائٹنگ ٹیبل پر ہاتھ کے درجنوں پرنٹس پڑے تھے، ٹیبل لیمپ جل رہا تھا اور لیمپ کی روشنی میں عمر رسیدہ ایک انگریز ہاتھ کے ایک نقشے پر جھکا ہوا تھا، اس کا گنجا سر لیمپ کی روشنی میں چمک رہا تھا، اس کے سر کی جلد پر براؤن رنگ کے چھوٹے چھوٹے سیکڑوں تل تھے، میں نے اتنی بڑی تعداد میں تلوں کے نشان زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے، مجھے کمرے کے ماحول میں عجیب قسم کی پراسراریت محسوس ہوئی۔

ہم دونوں میز کے قریب کھڑے ہو گئے، بوڑھا ہاتھ کے پرنٹ پر بدستور جھکا رہا، ہمیں جب اس پوزیشن میں کئی منٹ گزر گئے اور ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر طنزیہ مسکراہٹوں کا تبادلہ کر کر کے تھک گئے تو بوڑھے نے اسی جھکی ہوئی پوزیشن میں کہا ''تم دونوں چالیس

پاؤنڈز نکال کر میز پر رکھ دو‘‘ ہم دونوں کے منہ سے ہنسی نکل گئی کیوں کہ یہ پچھلے پندرہ منٹوں میں اس کمرے کی پہلی آواز تھی، وہ ایک ایسا گونگا بہرہ کمرہ تھا جس کا چھوٹا سا پنکھا بھی بغیر آواز کے چل رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا بوڑھے پامسٹ نے تمام آوازوں کو کان سے پکڑ کر کمرے سے نکال دیا ہے۔

وہ کمرے کی خاموشی کا حصہ بن کر دو چار سو سال سے ہاتھوں کے پرنٹس پر جھکا ہوا ہے اور ہم اس صدی کے پہلے لوگ ہیں جنھوں نے اس کے مقدس معبد کو اپنے پاؤں اور طنزیہ مسکراہٹوں سے آلودہ کرنے کی کوشش کی اور وہ ابھی سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھے گا، گاڈ فادر کی شیطانی آواز میں ہمیں اٹھا کر بحرا لکاہل میں پھینکنے کا حکم دے دے گا، میں نے فوراً جیب سے پچاس پاؤنڈ کا نوٹ نکالا اور اس کی میز پر رکھ دیا۔

اس نے نوٹ کی طرف دیکھے بغیر سختی سے کہا ’’اونلی فورٹی پاؤنڈز، ناٹ ففٹی‘‘ میں نے فوراً گھبرا کر نوٹ اٹھالیا، جیبیں ٹٹولیں، چالیس پاؤنڈز اکٹھے کیے اور میز پر رکھ دیے، بوڑھا مکینیکل انداز سے سیدھا ہو گیا، اف خدایا، میں اس کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا، اس کے چہرے پر سیکڑوں جھریاں تھیں اور یہ تمام جھریاں جمی ہوئی آبشار کی طرح چہرے کی ہڈیوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں اور جب وہ بولتا تھا تو یہ جھریاں تار پر لٹکے ہوئے کپڑوں کی طرح دائیں بائیں اور شمالاً جنوباً جھولتی تھیں۔

ہم دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے، میرے دوست کو اپنی شادی کے بارے میں جاننے کا تجسس تھا، وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے کسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن یہ شادی ممکن نہیں تھی چناں چہ اسے جہاں کوئی پامسٹ، آسٹرالوجسٹ یا روحانی شخصیت ملتی تھی وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیتا تھا اور جب تک پامسٹ اس کی مرضی کی بات نہیں کرتا تھا وہ اس کی

جان نہیں چھوڑتا تھا، اس نے اس بار بھی یہی کیا۔

اس نے دونوں ہاتھ ٹیبل لیمپ کی ''بیم'' کے نیچے رکھے اور اس سے پوچھا ''مسٹر فراسٹ، کیا میری شادی میری مرضی کے مطابق ہو جائے گی'' فراسٹ نے قہقہہ لگایا، اس نے کرسی کی پشت کے ساتھ ٹیک لگائی، آدھا بجھا ہوا سگار جلایا اور اس کے بعد وہ بات کہہ دی جس نے میری زندگی کا رخ تبدیل کر دیا، یہ وہ سچ، یہ وہ حقیقت تھی جسے میں برسوں سے کتابوں، درگاہوں، دانشوروں اور روحانی بابوں کی مجلسوں میں تلاش کر رہا تھا لیکن مجھے یہ حقیقت ملی کہاں؟

لندن کی ایک گم نام گلی کی چھوٹی سی کافی شاپ کی دوسری منزل کے چھوٹے سے کمرے میں ستر اسی سال کے گم نام پامسٹ کے پاس، شاید علم بھی رزق کی طرح ہوتا ہے، یہ بھی آپ کو دانہ دانہ کر کے ملتا ہے اور یہ جب، جہاں اور جس کے ساتھ لکھا ہوتا ہے آپ دھکے، ٹھڈے کھاتے ہوئے اس تک پہنچ جاتے ہیں اور رزق کے نوالے اور ٹھنڈے گرم پانی کے گھونٹ کی طرح علم بھی آپ کی دسترس میں آ جاتا ہے، میرے ایک بزرگ نے دس سال پہلے کہا تھا ''بیٹا مَت (عقل) دینے والی چیز نہیں، یہ لینے والی جنس ہے'' اور مجھے اور میرے دوست کو وہ سچ لندن کے اس گم نام پامسٹ نے تھما دیا۔

پامسٹ نے سگار کا کش لیا اور بولا ''سوال یہ نہیں کہ آپ کی شادی وہاں ہو گی یا نہیں، سوال یہ ہے کہ کیا وہ شادی آپ کو خوشی بھی دے گی'' ہم دونوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ بولا ''میں پچاس سال سے اس پروفیشن میں ہوں، میں نے اب تک ہزاروں لوگوں کے ہاتھ دیکھے، ان میں سے ہر دوسرے شخص کو دولت چاہیے تھی، ہر تیسرا شخص مرضی کی شادی کرنا چاہتا تھا، ہر چوتھا شخص پروفیشن میں ترقی کا متمنی تھا، ہر پانچواں شخص اولاد تلاش کر رہا تھا اور ہر چھٹا شخص دشمن کو ذلیل وخوار دیکھنا چاہتا تھا لیکن ان میں سے آج تک کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ ''جو

دولت مجھے ملے گی کیا مجھے اس سے خوشی بھی نصیب ہوگی، کیا میں مرضی کی شادی کے بعد خوش بھی رہ سکوں گا، کیا میری ترقی مجھے خوشی بھی دے گی، کیا مجھے اس اولاد سے خوشی بھی ملے گی جس کو میں ڈاکٹروں کے کلینکس میں تلاش کر رہا ہوں اور کیا دشمن کے ذلیل وخوار ہونے کے بعد میں خوش ہو جاؤں گا''۔

وہ رکا، اس نے سگار کا لمبا کش لیا اور بولا ''ہم لوگ خوشی اور سکون کی تلاش میں ہیں، یہ دونوں چیزیں ہماری ہر حرکت، ہمارے ہر کام کی وجہ اور مقصد ہیں اور اگر انسان کی زندگی سے خوشی کی تلاش اور سکون کی جستجو نکال دی جائے تو انسان اور چمپینزی میں کوئی فرق نہیں رہے گا، دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر پتھر کے زمانے میں واپس چلے جائیں گے لیکن ہم ان دونوں چیزوں کو ہمیشہ فراموش کر بیٹھتے ہیں، ارے بھائی پانی مقصد نہیں ہوتا، مقصد پیاس بجھانا اور جسم کے خلیوں کو شفاف اور صاف ستھرا مائع فراہم کرنا ہوتا ہے، خوراک مقصد نہیں ہوتی، مقصد بھوک مٹانا ہوتا ہے، دولت مقصد نہیں ہوتی، مقصد اس دولت سے خوشیاں حاصل کرنا ہوتا ہے اور شادی مقصد نہیں ہوتی، مقصد وہ مسرت، وہ سرشاری ہوتی ہے جو قدرت دو انسانوں کے درمیان کہیں چھپا دیتی ہے اور یہ دونوں مل کر اسے تلاش کرتے ہیں''۔

اس نے قہقہہ لگایا، قہقہے کے ساتھ ہی اس کی جھریاں ہوا میں لہرائیں اور اس کے دانتوں کی درزوں سے سگار کے دھوئیں کی باریک باریک سی تاریں باہر نکلنے لگیں، وہ بولا ''ہمیں خوشی کو پہلی ترجیح دینی چاہیے، ہم اگر اسے ٹاپ پر رکھیں گے تو ہی ہماری زندگی اچھی اور بامعنی ہو سکے گی کیونکہ میں نے ایسے ہزاروں لوگ دیکھے ہیں جو اربوں پاؤنڈز کے مالک ہیں لیکن اس دولت نے انھیں خوشی نہیں دی، میں نے دنیا کے بہترین اور خوب صورت ترین جوڑوں کو اسی کمرے، انھیں کرسیوں پر روتے دیکھا ہے، میں نے دنیا کے کام یاب ترین لوگوں کو بھی اداس اور مایوس

دیکھا ہے اور میں نے خوب صورت اور ذہین ترین بچوں کے والدین کو بھی اپنی اولاد سے مایوس اور دکھی پایا۔

انسان کو کامیابیاں، ترقیاں، ساتھی اور دوست خوشی نہیں دیتے، انسان کو خوش رہنے کا آرٹ خوشی دیتا ہے اور جو شخص دس پاؤنڈ میں خوش رہنے کا ہنر نہیں سیکھتا اس شخص کو دس بلین پاؤنڈز بھی خوش نہیں کر سکتے، جو شخص دوسروں کے بچوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوسکتا وہ دس بچوں کا باپ بن جائے تو بھی اسے خوشی نہیں مل سکتی، جو شخص پانچ منٹ کی ملاقات، ڈیڑھ منٹ کا ٹیلی فون اور ایک ایس ایم ایس سے خوش نہیں ہوسکتا اس شخص کو عمر بھر کا ساتھ بھی خوشی نہیں دے سکتا، جو شخص مسجد، مندر، چرچ یا سینا گوگ کی دہلیز پر ایک قدم رکھ کر خوش نہیں ہوسکتا اسے عمر بھر کی عبادت خوشی نہیں دے سکتی۔

جو شخص برگر کی ایک ''بائٹ'' پر خوش نہیں ہوسکتا وہ دنیا کے سب سے بڑے ریستوران کی مہنگی ترین ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر بھی خوش نہیں ہوسکتا اور جو شخص ٹرین یا بس کی سیٹ ملنے پر خوش نہیں ہوسکتا وہ بوئنگ کارپوریشن یا مائیکروسافٹ کا چیئرمین بن کر بھی خوشی محسوس نہیں کر سکتا، ہم جب تک دعا اور کوشش سے پہلے خوشی کی عادت نہیں ڈالتے کامیابی اس وقت تک ہمیں خوشی نہیں دیتی چناں چہ خوشی اصل اثاثہ ہوتی ہے''۔ وہ بولتے بولتے رک گیا۔

میں نے اس سے پوچھا ''لیکن کیا اپنی خوشی خودغرضی نہیں ہوتی'' اس نے قہقہہ لگایا اور بولا ''نہیں عام آدمی کے لیے نہیں، سینیٹ (صوفی) اور عام آدمی میں فرق ہوتا ہے، سینیٹ وہ ہوتا ہے جو دوسروں کو خوش کر کے خوش ہوتا ہے جب کہ عام آدمی خوش ہو کر دوسروں کو خوش کرتا ہے، ہم سب عام لوگ ہیں، ہم سینیٹ نہیں ہیں چناں چہ خوش ہونا سیکھو ورنہ ہر کامیابی، ہر وش (دعا) اور ہر سٹرگل (کوشش) کے آخر میں تمہارے لیے دکھوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا''۔

پروفیسر محمد عقیل

کرونا وائرس: نیچر کا انتقام (2)

نیچر کی چارج شیٹ

ہم نے بیان کیا کہ نیچر دو بنیادی اصولوں پر کھڑی ہے۔ پہلا اصول مادی قوانین کا ہے اور دوسرا اخلاقی قوانین کا۔ مادی قوانین سائنس کے زمرے میں آتے ہیں اور اخلاقی قوانین اخلاقیات کے زمرے میں۔ جب ان دو اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو نیچر ری ایکٹ کرتی ہے۔

گذشتہ سو سالوں میں گلوبلائزیشن کے دور میں فلاح کے بنیادی اصول کی اجتماعی اور انفرادی دونوں سطحوں پر خلاف ورزی ہوئی۔ سیاست، معیشت، معاشرت اور اخلاقیات میں انسان کی مجموعی کارکردگی بہت پریشان کن رہی۔ سیاست ظلم و ستم کا دوسرا نام بن گئی، معیشت دولت کی عدم مساوات جیسے ظالمانہ اصول پر کھڑی ہوگئی، معاشرت خودغرضی اور بیمار لائف اسٹائل پر تعمیر ہونے لگی۔

چنانچہ آج نیچر نے ری ایکٹ کر کے اس گلوبلائزیشن پر مبنی دنیا کو وارننگ دی ہے۔ اس وبا نے گلوبلائزیشن کے ہر اس پہلو کو نشانہ بنایا ہے جو اس عالمی ظلم کا باعث ہے۔ اس کا پہلا نشانہ نام نہاد انفارمیشن ایج کے نام پر ہونے والی ترقی ہے جس نے انسانوں کو انسانوں سے دور کر کے مادیت اور مشینوں کے قریب کر دیا اور اسے خودغرض مخلوق بنا دیا۔ اسی لیے سب سے پہلے سوشل تعلقات پر ضرب لگائی گئی ہے۔ انسان نے گلوبلائزیشن اور سوشل میڈیا کی بنا پر تمام تعلقات کو پس پشت ڈال دیا اور وہ بس موبائل، مشینوں اور مادیت کا ہو کر رہ گیا۔ اب یہی انسان آئیسولیشن یعنی قید تنہائی میں مشینوں کے ساتھ قید ہے اور اسے انسانی رشتوں کی اہمیت یاد دلائی جا رہی ہے۔

دوسری ضرب معیشت پر لگائی گئی ہے اور وہ نظام جو ظلم پر مبنی تھا اس کا لاک ڈاؤن ہو چکا

ہے۔ محلات ویران ہو گئے، اونچی عمارتیں سنسان، بازار سائیں سائیں کر رہے ہیں، پرتعیش ہوٹل بند ہو چکے، سامان عیش و عشرت فراہم کرنے کے اڈے اجڑ گئے، قیمتی ملبوسات حقیر ہو گئے اور پرتعیش رہن سہن اور آرام دہ طرز زندگی سب پر قدغن لگ چکی۔

ایک اور ضرب دولت کی تقسیم کے نظام پر لگی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے ظالمانہ نظام پر مبنی تجارت بند ہو چکی۔ اشیاء و خدمات کی تجارت کا وہ طوفان جس کا مقصد غریب ملکوں کو منڈی بنا کر ان کی دولت اپنے ملک میں منتقل کرنا تھا، تھم چکا ہے۔

نیچر کی اس وارننگ میں صنعتی ترقی کے نام پر تباہی مچانے والوں کے لیے بھی ایک وارننگ ہے جنھوں نے درختوں کا قتل عام کیا، تمدن کے نام پر جنگلات کی جڑ کاٹ دی، گیسوں سے گلوبل وارمنگ پیدا کی۔ اس میں ایک وارننگ سرمایہ داروں سے متعلق بھی ہے جن کی زندگی کا واحد مقصد ہر قسم کی فلاح سے بالاتر ہو کر منافع کو زیادہ سے زیادہ کرنا تھا۔ آج وہ اپنے دیوالیے کو روکنے کی جستجو کر رہے ہیں۔

یہ ان ریاستوں کے لیے بھی ایک وارننگ ہے جنھوں نے اسلحے کی ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ شروع کر کے اپنے سارے وسائل دفاع کے نام چند مخصوص طبقات کے لیے وقف کر دیے اور صحت جیسے اہم شعبے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اب نیچر پیغام دے رہی ہے کہ دفاع کی ایک اور سرحد ہے جو انسان کی صحت سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس پر دفاع کے لیے فوج نہیں بلکہ ڈاکٹروں کی فوج پر خرچ کرنا ضروری ہے۔

نیچر کی یہ وارننگ مذہب کے لیے بھی ہے جس کا بنیادی مقصد انسان کو مقصد حیات سے آگاہ کرنا، خدا اور بندے کے تعلق کو بیان کرنا اور بندے اور بندے کے تعلق کو مضبوط کرنا تھا۔ لیکن مذہب کے نمائندے بالعموم اس مقصد میں ناکام رہے۔ آج دنیا بھر کی عبادت گاہیں بند ہیں جو اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ نیچر کا خالق مذہب کے کرتا دھرتا لوگوں کے کارناموں سے بحیثیت مجموعی خوش نہیں۔

نیچر کی یہ وارننگ عالمی سربراہوں کے لیے بھی ہے جو اس ظالمانہ نظام کے راہنما ہیں۔ ان کا کام تو ایک باپ کی حیثیت سے کمزوروں پر دست شفقت رکھنا اور دنیا سے ظلم و استحصال کا خاتمہ تھا۔ اسی بنا پر نیچر نے بعض سربراہان کو متاثر کر کے بتایا کہ یہ بھی اس ری ایکشن کا ایک سبب ہیں۔

آج کی تاریخ میں اس وائرس سے متاثر ہونے والے زیادہ تر وہ ممالک اور اقوام ہیں جو گلوبلائزیشن کے لیڈر رہیں۔ لیکن غریب ممالک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ وائرس ان کے لیے ایک پیغام ہے کہ ان پر ہونے والے ظلم و ستم کی تمام ذمہ داری طاقتور اقوام پر ہی لاگو نہیں ہوتی، وہ خود بھی اس کے قصور وار ہیں۔ انہوں نے خود اپنی سستی، کاہلی، جہالت، بے نظمی اور غلط فیصلہ سازی سے اپنی حالت کو بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا تو خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت آپ نہ بدلے۔

آگے کیا ہونے والا ہے؟

تیسرے صنعتی انقلاب سے پہلے ہونے والے واقعات کا پیٹرن بہت اہم ہے۔ پہلی جنگ عظیم، اس کے بعد اسپینش فلو اور بالآخر دوسری جنگ عظیم۔ اس صدی کا پیٹرن بھی ایک اندازے کے مطابق ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ گذشتہ ایک دہائی سے مڈل ایسٹ اور شام میں جاری جنگ میں کم و بیش تمام ہی عالمی طاقتیں بالواسطہ یا بلاواسطہ ملوث ہو چکی ہیں۔ اسے ہم پہلی جنگ عظیم کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسپینش فلو کی طرز پر کرونا وائرس کی یلغار ہے جس کی ابھی ابتدا ہے۔ ماہرین کے اندازے بتا رہے ہیں کہ اموات کے علاوہ معاشی کرائسس کا آنا لازمی ہے۔ اس کرائسس کے نتیجے میں طاقتور اور کمزوروں کے درمیان بقا کی جنگ شروع ہو جائے گی جو تیسری عالمی جنگ کو جنم دے سکتی ہے۔

لیکن یہ جنگ دوسری جنگ عظیم کی طرح روایتی ہتھیاروں سے نہیں لڑی جائے گی۔ اس کے پیچھے وہ مہلک ایٹم بم ہیں جن سے دنیا کئی مرتبہ تباہ ہو سکتی ہے۔ اس جنگ میں بچنے والے لوگ

ارتقاء کے اگلے نہیں بلکہ پچھلے مرحلے میں واپس چلے جائیں گے جسے ہم پتھر کے دور سے تعبیر کرتے ہیں۔

نیچر ہمیں مسلسل وارننگ دے رہی ہے کہ ہم اجتماعی فلاح کے تصور پر اپنی اخلاقیات مرتب کرلیں لیکن ایسا نہیں ہورہا۔ دنیا کی سیاست، معیشت، معاشرت اور طرز زندگی نیچر کے خلاف چلی جارہی ہے۔ ایک وقت آئے گا یہ چھوٹی چھوٹی وارننگز بڑی سزا میں تبدیل ہوجائیں گی اور ہم دوبارہ اسی دور میں واپس چلے جائیں گے جہاں سے ہزاروں برس پہلے ارتقاء کیا تھا۔

کیا کیا جائے؟

نیچر کے مادی قوانین پر تو سائنس دان تحقیق کرہی رہے ہیں اور جلد یا بدیر اس بیماری کا علاج دنیا میں آجائے گا۔ اصل مسئلہ اس کا علاج نہیں بلکہ ان غیر مادی واخلاقی قوانین کو ایڈریس کرنا ہے جو نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ ان پر ریسرچ کرنا درحقیقت اہل مذہب اور سماجی اسکالرز کی ذمہ داری ہے۔ مذہبی علما کی اکثریت تو رسومات میں کھوچکی ہے اور جدید دور کے تقاضوں سے نبٹنے کے لیے مطلوبہ استعداد ہی نہیں رکھتی۔ سماجی علماء اس حقیقت کو ماننے سے انکاری ہیں کہ نیچر کا ردعمل ان اخلاقی قوانین پر بھی ہوسکتا ہے۔ مقدمہ ابن خلدون نے قوموں کے عروج وزوال پر جو اصول بیان کیے ہیں وہ اخلاقی ہی ہیں۔ چونکہ دنیا اب ایک گلوبل ویلج بن چکی اس لیے اب یہ قوموں کا عروج وزوال عالمی عروج وزوال بن چکا ہے۔

اس پر ریسرچ کی ضرورت ہے کہ وہ کون سے اخلاقی معیارات ہیں جو نیچر کے کوڈ سے ہم آہنگ ہیں اور کون سے معاملات نیچر کو ری ایکٹ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جب بھی اجتماعی فلاح کے اصول کو نظر انداز کیا گیا اور ظلم وستم کو فروغ دیا گیا، نیچر نے ری ایکٹ کیا۔ دوسری جانب جب بھی فلاح کو بنیادی مرکزی خیال بنایا گیا، نیچر نے انسانوں کی مدد کی اور انہیں ارتقاء کے مراحل سے گزارتے ہوئے آج اس جدید دور میں لے آئی۔

دوسری جانب غریب قومیں جس استحصال کا شکار ہوئیں، وہ اپنی کوتاہیوں کی بنا پر خود اس جرم

میں شریک معلوم ہوتی ہیں۔ نااہلی، ڈسپلن کی خلاف ورزی، خودغرضی، شارٹ ٹرم سوچ، سستی، کاہلی، بدعنوانی، لالچ اورنام نہادنسلی یامذہبی برتری کا احساس وہ جرائم ہیں جو پسماندہ قوموں میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔

ان تمام اصولوں کونظرانداز کرکے نیچر کے ردعمل سے نہیں نبٹا جاسکتا۔ یہ بات انفرادی سطح پر سمجھنے کی بھی ضرورت ہےاوراجتماعی سطح پر بھی۔

آخری سوال۔خدا کہاں ہے؟

یہ وہ سوال ہے جو بالعموم مذہبی ذہنوں میں گونجتا ہے۔اس سوال کی اول تو کوئی گنجائش ہی نہیں لیکن یہ پھر بھی ہراس قسم کے واقعے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نیچر اورخدامیں تضاد کا تصور ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نیچرتو اسباب وعلل کے قوانین کے تحت کام کررہی ہےاورخدا کا خدا ہونا اس وقت مانا جائے گا جب وہ ان اسباب سے ماورا ہوکر کام کرے۔ یہاں ایک منطقی مغالطہ پیدا ہوجاتا ہے کہ جوکام اسباب کے ذریعے ہووہ نیچر کے تحت ہے جواس سے ماورا ہووہ خدا کے ذمے۔

مذہب کا بنیادی مقدمہ یہی ہے کہ ہر شے کا خالق ہےتو نیچر، اس کے قوانین اوراس کے اطلاق سب کا خالق اور چلانے والا خداہی ہے۔ چنانچہ نیچر کے تحت ہونے والے تمام قوانین خدا ہی نے بنائے ہیں اورخداہی انہیں بالواسطہ یابراہ راست کنٹرول کررہا ہے۔

اس پرایک منطقی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خداہی سب کچھ دیکھ رہا ہےتو وہ اس وائرس کو کنٹرول کرنے کے لیےکوئی اقدام کیوں نہیں کرتا؟ یہ سوال بھی اسی منطقی مغالطے کے تحت پیدا ہوتاہے۔سائنس جن قوانین پرکام کرتی ہے وہ خداہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ خداہی کسی کوانسپائرکرکےاس کا علاج سجھا دیتا ہےاوریوں بیماری کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ بظاہراس کا خاتمہ اسباب کےتحت ہوتا ہےلیکن اس کے پیچھےخداہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔

اس پرایک اورسوال پیدا ہوتا ہے کہ خداتو سراپا خیر ہے، آخراس نے یہ وائرس یااس قسم کی وبا

پیدا ہی کیوں کی کہ لاکھوں انسانوں کی زندگی داؤ پر لگ گئی؟ یہ دراصل خیر وشر کے محدود تصور کی بنا پر سوال پیدا ہوتا ہے۔ خیر وشر کا تصور ایک اضافی معاملہ ہے اور یہ اس وقت تک اضافی رہتا ہے جب تک کامل معلومات نہ ہوں۔ مثال کے طور پر ایک شیر جب کسی ہرن کا شکار کرتا ہے تو شیر کے لیے یہ سراپا خیر ہے کیونکہ اس کی بقا کے لیے یہ شکار لازمی ہے۔ دوسری جانب ہرن کے لیے یہ شر ہے کیونکہ اس سے اس کی جان چلی جاتی ہے۔

کرونا وائرس انسانوں کی نگاہ سے دیکھیں تو یہ شر ہے البتہ اسے بڑے کینوس پر دیکھا جائے تو اسی تباہی سے وہ خیر سامنے آتا ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں۔ اس کی مثال ماضی میں اسپینش فلو سے لی جاسکتی ہے۔ اُس وقت انسانیت نسل پرستی، فاشزم، ارتکاز دولت، ظلم اور ستم پر مبنی نظام چلا رہی تھی۔ ۱۹۲۰ میں اسپینش فلو نے اُس وقت کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو ختم کر کے انسانوں کو سوچنے کا موقع دیا۔ نہ ماننے پر دوسری جنگ عظیم ہوئی اور اس کے بعد انسانوں کو وہ بات سمجھ آئی جو وہ آسانی سے سمجھ نہیں سکے تھے۔ اس کے بعد انسانوں نے جو ترقی کی وہ انہی چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کا نتیجہ تھی۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیچر تو اسباب و علل کے تحت کام کرتی ہے۔ اگر کائنات انہی مادی قوانین کے تحت چل رہی ہے تو خدا کی کیا ضرورت؟ نیچر یقیناً خدا کے قوانین کے تحت چل رہی ہے لیکن یہ چل نہیں رہی بلکہ خدا اسے چلا رہا ہے۔ خدا کا اصول محض مادی نہیں بلکہ اخلاقی بھی ہے۔ چنانچہ نیچر کا ری ایکشن جہاں مادی قوانین کے مطابق ہوتا ہے وہیں اخلاقی اور غیر مادی اصولوں پر بھی ہوتا ہے۔

ایک اور سوال یہ کہ اگر معاملہ اخلاقی یا مذہبی بنیادوں پر بھی ہے تو پھر خدا مغربی اقوام کو کیوں تباہ نہیں کرتا جہاں جنسی فحاشی، شراب، جوا، سور، شرک اور دیگر برائیاں عام ہیں؟ اس مغالطے کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سمجھنا پڑے گا۔ اخلاقی میزان یعنی یونی ورسل حق کی آزمائش میں سب سے پہلے کسی قوم پر وہ باتیں ماننا لازمی ہے جس کو وہ حق سمجھتی ہے۔ یہ وہ حق ہے جو اسے فطرت کی

روشنی سے ملا یا پھر سوسائٹی کے نظمِ اجتماعی نے دیا۔ ضروری نہیں کہ اس کے پاس سو فی صد حق موجود ہو، لیکن جتنا اخلاقی علم ہے اسی کے مطابق وہ قوم مکلّف ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو مغربی و دیگر اقوام جن باتوں کو اخلاقی، معاشرتی، قانونی لحاظ سے درست سمجھتے ہیں ان کی اکثریت اس پر عمل کرتی ہے۔ دوسری جانب اکثر مسلم اقوام اس پہلے ٹیسٹ میں بری طرح ناکام معلوم ہوتی ہیں۔ وہ جن باتوں کو حق سمجھ کر دنیا سے منوانا چاہتے ہیں، خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ اخلاقیات سے روگردانی، قانون کا عدم احترام، مسلمہ مذہبی تعلیمات کو پس پشت ڈال دینا، قرآن کو خدا کی کتاب کہنے کے باوجود اس کو نظر انداز کر کے اس کی توہین کرنا یہ وہ چند جرائم ہیں جو ہم میں کامن ہیں۔ سب سے بڑا جرم یہ کہ غیر مسلم اقوام کو دعوت دیے بنا ان پر وہ مذہبی قوانین لاگو کرنا جس کے ابھی وہ مکلّف ہی نہیں بنے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکثر مذاہب ان آفات سے نبٹنے کے لیے وظیفے وغیرہ بتاتے ہیں۔ کیا ان سے کچھ فرق پڑ سکتا ہے؟ دیکھیں، انسان محض ایک مادی مخلوق نہیں بلکہ اس کی ایک نفسیات بھی ہوتی ہے اور اس نفسیات کا اثر اس کے مادی وجود پر بھی پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ایک مکمل یقین سے ایک معمولی دوا کھاتا ہے تو یہ یقین پلے سیبو افیکٹ (placebo effect) کے قانون کے مطابق بہت تیزی سے کام کرتا ہے اور اس کا مرض دور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ وظیفے جن میں کوئی اخلاقی برائی نہ ہو اور یہ عالم اسباب میں تدبیر کرنے کے بعد کیے جائیں تو ان میں کوئی مضائقہ نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خدا کی ضرورت ہی کیا جو اسباب کے تحت کام کرتا ہے؟ خدا اسباب سے ماورا ہے اور اسباب اس کے تحت کام کرتے ہیں۔ لیکن عالم اسباب بھی خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اس کو ماننا خدا ہی کو ماننا ہے۔ نیز ایک وقت آتا ہے کہ جب اسباب اور تدبیر ناکام ہو جاتے ہیں تو خدا جس طرح چاہے اپنے بندے کی مدد کرتا ہے۔ لیکن یہ مدد اسی وقت آتی ہے جب اسباب کی دنیا میں انسان اپنی سی کوشش کر چکا ہو اور دعا کی قبولیت کی شرائط پوری کر چکا ہو۔

ایک اورسوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نیچر کا یہ ری ایکشن انسانوں کی اجتماعی کوتاہیوں کے سبب آیا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ اس کے ذمہ دار تو زیادہ تر ترقی یافتہ اور مغربی اقوام ہیں۔ اس کا جواب نیچر ہی کے ایک اصول میں موجود ہے۔ مغربی اور ترقی یافتہ اقوام جو ایجاد یا اچھا کام کرتی ہیں اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ یہ غیر ترقی یافتہ قومیں بھی اٹھاتی ہیں۔ بس جب وہ ان کے اچھے کام سے استفادہ کرنے کا حق رکھتی ہیں تو برے کام سے نقصان بھی اٹھانا اسی اصول کے تحت ہے۔

ایک اورسوال یہ کہ اب انسانیت اس وبا میں پھنس چکی ہے تو کیا کوئی توبہ واستغفار اس معاملے میں مددگار ہوسکتی ہے؟ دیکھا جائے تو نیچر کا یہ ری ایکشن گذشتہ سو سال کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ جو بھی ری ایکشن ہونا ہے اسے کم تو کیا جاسکتا ہے، لیکن ختم بالکل نہیں کیا جاسکتا۔ اجتماعی توبہ کا مقصد گلوبلائزیشن کے ان گناہوں سے توبہ کرنا ہے جو نیچر کے خلاف تھے۔ انفرادی سطح پر بھی فلاح کے اصول کو اپنانا اس کا علاج ہے۔ لیکن علاج کا اثر ہونے میں وقت لگتا ہے۔ اس لیے فوری طور پر شاید کوئی ریلیف نہ ملے لیکن اس وبا کے بعد اصلاح سے انسانی ارتقا آگے بڑھنے کی امید ہے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں مزید تباہی۔

آخری سوال یہ کہ اس پورے معاملے میں مذہبی لوگ بالخصوص مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ دیکھیں مسلمان اس دنیا کو ویسے بھی ایک عارضی جگہ سمجھتا اور اسے دارالامتحان مانتا ہے۔ اب یہ اس کے علم کا امتحان بھی ہے اور عمل کی آزمائش بھی۔ یہاں اسے خدا کے وجود، اس کی صفات، توکل، تفویض، رضا، صبر اور تقدیر جیسے تصورات کا علمی امتحان درپیش ہے۔ دوسری جانب اللہ سے تعلق اور اس کے بندوں کو فلاح پہنچانے کا عملی امتحان بھی درپیش ہے۔ یہ ایک جہاد ہے جس میں ہار اور جیت اتنی اہم نہیں بلکہ یہ اہم ہے کہ ہم کس نیت سے اس جنگ میں کودے اور کس طرح اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کیا۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (76)

شخصی رویے

مضامین قرآن کے سلسلے کے آغاز میں ہم نے یہ بات واضح کی تھی کہ قرآن مجید ہزاروں آیات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ مگر مضامین کے اعتبار سے یہ انتہائی مختصر ہے جس کے بنیادی موضوعات انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ یہ موضوعات نہ صرف تعداد میں بہت کم ہیں بلکہ آپس میں مربوط طریقے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہزاروں آیات پر مشتمل پورا قرآن مجید صرف تین بڑے بنیادی اور چند درجن ذیلی عنوانات کے تحت نہ صرف مرتب ہو جاتا ہے بلکہ یہ مضامین و عنوانات ہر فرد اور ہر دور کے انسان سے براہ راست متعلق رہتے ہیں۔ یہ تین بنیادی موضوعات درج ذیل ہیں۔

۱) دعوت دین اور اس کے ردوقبول کے نتائج

۲) دعوت کے دلائل

۳) مطالبات

ہم ابتدائی دو موضوعات یعنی دعوت دین اور اس کے ردوقبول کے نتائج اور دعوت کے دلائل پر بہت تفصیل کے ساتھ گفتگو کر کے یہ جائزہ لے چکے ہیں کہ ان کے ذیل میں قرآن مجید نے کیا کچھ بیان کیا ہے۔ جبکہ مطالبات کے ضمن میں ہم نے اخلاقی مطالبات کا جائزہ مکمل کر لیا ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے قبل ضروری ہوگا کہ ان مباحث کا خلاصہ کر لیا جائے۔

اخلاقی مطالبات کی بحث کا آغاز ہم نے خالق کے حقوق سے کیا تھا۔ ہم نے بتایا تھا کہ اس ضمن میں دین کا بنیادی مطالبہ شرک سے پرہیز اور تنہا ایک خدا کی عبادت کرنا ہے۔ پھر ہم نے عبادت کے اس نظام کا جائزہ لیا تھا جو دین نے بندگی رب کے تقاضے کی تکمیل کے لیے خود سکھایا ہے۔ اس میں نماز، انفاق، روزہ و اعتکاف، حج و عمرہ و قربانی کی حقیقت، مقصد اور مقررہ شریعت

کے اندر پوشیدہ روح کی شرح و وضاحت کی تفصیل کی گئی تھی۔شریعت اوراحکام اسی وقت زیر بحث آئیں گے جب مطالبات کے ضمن میں شریعت کے مطالبات پر بات ہوگی۔خالق کے حقوق کے ضمن میں جس دوسری چیز کو ہم نے تفصیل سے سمجھا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی قرآنی اساسات ہیں جو اس تعلق کو ایک زندہ تعلق بنا دیتی ہیں۔ان میں پہلی اساس کو ہم نے ایمان ویقین، اسلام وقنوت اور اخلاص کے عنوان سے بیان کیا تھا۔دوسری کو عبادت، اطاعت، بر واحسان کے عنوان سے، تیسری کو محبت، شکر اور نصرت دین سے، چوتھی کو ذکر وفکر اور دعا، پانچویں کو تقویٰ، چھٹی کو انابت اور توبہ، ساتویں کو صبر ورضا اور آٹھویں اساس کو توکل وتفویض کے عنوان سے بیان کیا تھا۔

اخلاقی مطالبات میں اس کے بعد مخلوق کے حقوق زیر بحث لائے گئے تھے۔اس میں پہلے مرحلے پر ہم ان حقوق کو زیر بحث لائے جن کا تعلق مختلف سماجی طبقات اور انسانی تعلقات سے تھا۔ یہ وہ حقوق ہیں جن کی ادائیگی کے معاملے میں عام طور پر انسانوں سے کوتاہی ہوتی ہے۔ خاص طور پر والدین، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور ماتحتوں اور معاشرے کے کمزور طبقات جیسے یتامیٰ، فقراء، مساکین، مسافر اور سائلین کے ساتھ قرآن مجید نے جس طرح حسن سلوک پر توجہ دلائی ہے اس کو ہم نے الگ الگ عنوانات کے تحت تفصیل سے بیان کیا تھا۔پھر اخلاقی طور پر ان مطلوب اور غیر مطلوب رویوں کا بیان شروع ہوا تھا جو ادائیگی حقوق پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ان میں پہلے ان رویوں پر بات کی گئی جو انسانی کردار کے کسی جامع وصف کو بیان کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں عدل وظلم، معروف ومنکر، حفظ فروج وفواحش اور عہد وامانت پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔ساتھ ہی ان اوصاف کے عملی اطلاقات کو بھی زیر بحث لا کر یہ بتایا گیا کہ ان اصولی چیزوں سے کیا اخلاقی احکام پھوٹتے ہیں۔اس کے بعد آخر میں ان اخلاقی صفات یا فضائل ورذائل کو زیر بحث لایا گیا جو متعین طور پر انسانی کردار کی کسی خاص خوبی یا خامی کو بیان کرتے ہیں۔

جامع اوصاف کی طرح اخلاق کے ان فضائل ورذائل سے جنم لینے والے اعمال پر

معاشرے کی تمام تر خیر وفلاح کا انحصار ہوتا ہے اور انھی پر کسی فرد کی اخروی فلاح منحصر ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ان پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے۔اس ضمن میں صدق وکذب، بہتان، تکبر اور حسد، بخل اور اسراف، قول احسن یا اچھی گفتگو پر تفصیل کے ساتھ بات کی گئی تھی۔ جس کے ساتھ اخلاقیات پر بحث مکمل ہوگئی۔ اب مطالبات کے ضمن میں دو چیزیں زیر بحث آنا باقی ہیں۔ ایک شرعی مطالبات یا شریعت کا قانون اور دوسرے وہ شخصی رویے جن پر قرآن مجید میں بالواسطہ یا بلاواسطہ توجہ دلائی گئی ہے۔

شخصی رویوں کی بحث

عام طور پر قرآن مجید میں بیان کردہ شخصی رویے زیر بحث نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان واخلاق کی دعوت کے برعکس جس پر فرد کی نجات موقوف ہے، شخصی رویوں کا دائرہ مباح امور تک ہی رہتا ہے۔ مگر بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ یہ شخصی رویے ایمان کی دعوت اور اخلاق کے مطالبات دونوں کی راہ میں مزاحم ہوجاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ رویے اخلاقی فضائل و رذائل پر اثر انداز ہوتے اور ان کے وجود میں آنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت میں ایک اچھی مثال قرآن مجید کا وہ حکم ہے جو اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّن (الحجرات 12:49) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ یعنی بعض زیادہ گمان کرنے سے پرہیز کرو۔ آگے قرآن مجید نے اس کی وجہ بھی بیان کی ہے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ گمان کرنا ایک انسانی ضرورت اور بہت زیادہ گمان کرنا ایک شخصی رویہ ہے جو اپنی ذات میں اخلاقی رذائل کی حیثیت نہیں رکھتا۔ مگر جب بہت گمان کرنے کی عادت ہوجائے پھر انسان بدگمانی بھی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ چیز اپنی ذات میں ایک گناہ ہے۔

اس کی ایک اور مثال جلد بازی ہے۔ یہ ایک شخصی رویہ ہے جو اپنی ذات میں اخلاقی طور پر محمود یا مذموم نہیں ہوتا۔ بعض اوقات جلد بازی فطری ہوتی ہے اور بعض اوقات ضروری بھی۔ یہ نہ بھی ہو تب بھی براہ راست اس کا ایمان واخلاق کی دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر قرآن مجید میں کئی مقامات پر یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کی عادت ایمانی دعوت کی قبولیت اور دینی مطالبات

کی تعمیل میں مزاحم بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس بات کی بہت زیادہ اہمیت ہے کہ اس طرح کے شخصی رویوں پر نگاہ رکھی جائے اور اس بات پر متنبہ رہا جائے کہ اگر ان سے نجات نہ بھی مل سکے، تب بھی کم از کم ایمان واخلاق کے کسی تقاضے کی راہ میں وہ کبھی مزاحم نہ ہوسکیں۔

ان شخصی رویوں کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ بعض اوقات انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ کسی اخلاقی برائی سے محفوظ رہے۔ مگر وہ کسی ایسی شخصی کمزوری کا شکار ہوتا ہے جس کے لازمی نتیجے کے طور پر کبھی نہ کبھی انسان اس اخلاقی برائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہوتا ہے کہ اس شخصی رویے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا جائے۔ اس کی ایک مثال بہت زیادہ گمان سے باز رہنے کا وہی حکم ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ یعنی گمان بہت زیادہ کرنے کی جب عادت ہوگی تو انسان کبھی نہ کبھی بدگمانی بھی کر ہی لے گا۔ اس کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس طرح کے شخصی رویے انسان کو دنیوی طور پر بھی بہت زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ گرچہ براہ راست یہ بات دین کا موضوع نہیں لیکن ان شخصی رویوں کی اس اہمیت سے واقف ہونے کے بعد کسی بھی شخص کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ اس پہلو سے اپنی اصلاح کر کے بہت سے دنیوی نقصانات سے بھی بچ سکتا ہے۔ اس ضمن کی آخری چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک بہت بڑا حصہ وہ ہے جو نہ دعوت دین پر مشتمل ہے، نہ دلائل پر، نہ دعوت کے ردوقبول کے نتائج کو بیان کرتا ہے نہ کوئی دینی مطالبہ زیر بحث لاتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جو زمانہ نزول اور اس سے پہلے کے واقعات، گفتگو اور احوال کو بیان کرتا ہے۔ یہ وہ تمام مواقع ہیں جہاں سیکھنے اور سمجھنے کی سب سے بڑی چیز وہ شخصی رویے ہوتے ہیں جن کا اظہار ان واقعات اور مکالموں میں پوری طرح ہو رہا ہوتا ہے جنھیں قرآن مجید بہت تفصیل کے ساتھ بیان کر رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انبیا کے واقعات میں جگہ جگہ یہ بات ملتی ہے کہ ان کی قوم کے کفر کی ایک بڑی وجہ تعصب اور اپنے باپ دادا کی روایت سے حمیت کا تعلق تھا۔ یہ ایک شخصی رویہ ہے جو اپنی ذات میں برا نہیں، مگر یہی وہ رویہ ہے جو انسان کو حق کے سننے، سمجھنے اور اسے قبول کرنے سے روک دیتا ہے۔ اس پہلو سے قرآن مجید کا مطالعہ بہت سی ایسی چیزیں ایک طالب علم پر واضح کر دیتا ہے جو براہ راست بیان نہیں ہو رہی ہوتیں اور ان کا سمجھنا انسانوں کو بڑی برائیوں میں پڑنے سے بچا لیتا ہے۔

پروین سلطانہ حنا

عیادت

بیمار کی حالت نہ پوچھو!
بے چارگی، رنج و مایوسی
میں درد کی شدت سہتا ہے
اور آتے جاتے موسم کے
سب لمحے گنتا رہتا ہے
دہلیز پہ رکھ کے آنکھوں کو
اس آس پہ بیٹھا رہتا ہے
منڈیر پہ کاگا[1] شور کرے
اور دل میں جوت جگا جائے
کوئی دستک ہو دروازے پر
کوئی اپنا پرایا آ جائے
دو بول تسلی کے بولے
پھر درد کی شدت تھم جائے
بیمار کے دل پر ہاتھ رکھے
اور چین اسے پھر آ جائے

1۔ کوا

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

ماہنامہ

اِنذار

فون: 0332-3051201 , 0312-2099389

ای میل: globalinzaar@gmail.com

web: www.inzaar.org

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

فی کاپی سالانہ سبسکرپشن چارجز: (بذریعہ رجسٹری) صرف 900 روپے

ایجنسی ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے۔ ایجنسی ڈسکاؤنٹ کے لیے کم از کم ہر ماہ پانچ رسالے لینا ضروری ہے۔

سبسکرپشن چارجز مندرجہ ذیل پر ارسال کریں	
Easy Paisa	Muhammad Shafiq 0334-3799503 CNIC # 42201-8355292-9
Money Order	Monthly Inzaar 4th Floor Snowhite Centre Abdullah Haroon Road Opp. Hotel Jabees Saddar Karachi
Account	Title of Account: Monthly Inzaar A/C # 0171-1003-729378 Bank Al Falah Saddar Branch Karachi.

آپ سے درخواست ہے کہ سبسکرپشن چارجز بھیجنے کے بعد اپنے نام اور موبائل نمبر کے ساتھ نیچے دیے ہوئے نمبر پر کال یا SMS ضرور کریں تا کہ آپ کے رسالے کی سبسکرپشن کی جا سکے۔ مزید معلومات کے لیے ان نمبرز پر رابطہ کریں۔ شکریہ

0332-3051201 , 0312-2099389

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے

2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوائیے

3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

Monthly
INZAAR

FEB 2021
Vol. 09, No. 02
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi